اہل حق کی نصرت وتائید اور اہل باطل کی تردید میں اٹھایا جانے والا قلم سب سے بہترین قلم ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ۔ التبیان في أیمان القرآن: ص:۳۱۰)

شمارہ نمبر ①

ماہنامہ

منہج سلف

شمارہ نمبر: ۱- رجب ۱۴۴۴ھ - بمطابق جنوری ۲۰۲۳ء

رحمت کائنات ﷺ کے مصائب کی شدت

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُخَافُ أَحَدٌ، وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ، وَلَقَدْ أَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُونَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ وَمَا لِي وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَأْكُلُهُ ذُو كَبِدٍ إِلَّا شَيْءٌ يُوَارِيهِ إِبْطُ بِلَالٍ». سنن الترمذي: (٢٤٧٢).

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے اللہ کی راہ میں اس طرح سے خوف زدہ کیا گیا کہ کسی دوسرے کو اس طرح سے خوف زدہ نہیں کیا گیا، اور مجھے اللہ کی راہ میں ایسی اذیتیں دی گئیں کہ کسی دوسرے کو اس جیسی نہیں دی گئیں۔ بعض اوقات پورا مہینہ اس حال میں گزر جاتا کہ میرے لئے اور بلال کے لئے کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی جسے کوئی ذی روح کھا سکے، مگر اتنی سی مقدار میں کہ جسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی بغل چھپالے۔“

www.salafimanhaj.info

ماہنامہ

منہج سلف

شمارہ نمبر: ۱-رجب ۱۴۴۴ھ-بمطابق جنوری ۲۰۲۳ء

زیر اشراف:
فاروق عبداللہ نراین پوری
ابواحمد کلیم الدین یوسف

مدیر:
حافظ علیم الدین یوسف

نائبان:
عبداللہ عبدالرشید مدنی
حافظ فیضان عالم

معاونین:
محمد آصف سلفی
حافظ آفتاب عالم
کامران اشرف سلفی

منہج سلف کے نام سے نشر ہونے والا یہ ایک برقی مجلہ ہے جس کا مقصد خالص سلفی دعوت کی نشر و اشاعت اور منحرفانہ وملحدانہ افکار کی بیخ کنی ہے۔

www.salafimanhaj.info

فہرست عناوین

اداریہ		3
فکری انحراف: اسباب وعلاج (قسط اول)	فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی	4
انکار سنت کے متعلق چند گزارشات	ابو احمد کلیم الدین یوسف	8
پھر آپ ہمارے اکابر علماے اہل حدیث کے منہج پر اعتراض کیوں نہیں کرتے؟	فاروق عبداللہ نراین پوری	14
کیا مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) مختلف فیہ مسئلہ ہے؟ (قسط اول)	حافظ علیم الدین یوسف	19
ایک اہم اعتقادی مسئلہ میں زاہد الکوثری کی تدلیس کا جواب	ابو احمد کلیم الدین یوسف	24
الولاء والبراء کا صحیح معنی ومفہوم (قسط اول)	عبداللہ عبدالرشید مدنی	27
قرآن مجید کی لغوی تفسیر: مفہوم وضوابط (قسط اول)	حافظ فیضان عالم	32
اہل بدعت سے علم حاصل کرنے اور ان کی تقریر وغیرہ سننے کے تعلق سے سلف صالحین کا منہج (قسط اول)	مامون رشید بن ہارون رشید سلفی	37
اسلامی نظام وراثت کی خوبیاں	فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی	41
منظومة البيقونية في مصطلح الحديث: تعارف اور شروحات (قسط اول)	ابو المدیح بلال الخلیلی	48

اداریہ

گزشتہ کچھ عرصے میں اعتدال کے نام پر بعض ایسے افراد کا ظہور ہوا جنہوں نے اسلام کے صاف و شفاف چہرے اور صحیح منہج پر تشدد کا لیبل لگا کر اپنی خود ساختہ راہ اعتدال کو اسلام بنا کر پیش کیا۔ چناچہ کوئی اسلامی واجبات و فرائض میں سختی کا دعوی کرتے ہوئے من چاہا آسان راستہ نکال رہا ہے، تو کوئی اہل بدعت کے تئیں اسلام کے بے لچک موقف کو پر تشدد بتا کر ان سے تعلقات بحال رکھنے کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ اس قسم کے افراد شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے نزول کا مقصد ہی تشدد اور شدت پسندی کا خاتمہ ہے۔"يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ"(اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فإذا رأيت الذين يتبعون ما تشابه منه فأولئك الذين سمى الله فاحذروهم»،(جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جو متشابہات کے پیچھے لگا رہتا ہے تو جان لو کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ اللہ رب العالمین نے اس آیت میں کیا ہے، لہٰذا ان سے دوری بنا کر رکھو)۔ [صحیح البخاری(۳۴/۶)]۔

منہج سلف میں ان خود ساختہ اعتدال کے مفاہیم کی کوئی جگہ نہیں، یہ منہج نبی اکرم ﷺ کا بنایا ہوا ہے جو وسطیت و اعتدال کی حقیقی تصویر ہے، یہی وہ طریق ہے جس کا سالک گمراہی سے محفوظ ہے اور مخالف راہ ہدایت سے بھٹکا ہوا ہے۔

ماہنامہ **"منہج سلف"** کا اجرا اسی منہج کی ترویج واشاعت کے لئے عمل میں آیا ہے، تاکہ عوام الناس منہج سلف سے روشناس ہو، نت نئے مسائل وافکار کو سلفی تناظر میں دیکھنے کی خو پیدا ہو، معاً شریعت کے نصوص، اس کے معانی و مطالب اور طرز استدلال کے تئیں اہل علم نے جس منہج کو اپنی زندگی میں برتا ہے، اس ماہنامے کے ذریعہ لوگوں کے قلوب واذہان میں اس منہج کا شعور قائم ہو سکے۔

فکری انحراف: اسباب وعلاج (قسط اول)

فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی
مدرس دار العلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ (بہار)

الحمد لله وكفى، وسلام على عباده الذين اصطفى، أما بعد:

فکری انحراف کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسانی تاریخ، جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور فرشتوں کو سجدہ تعظیمی بجالانے کا حکم فرمایا تو ابلیس وہ پہلا شخص تھا جس نے فکری کج روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس حکم سے سرتابی کی اور اپنی بغاوت اور فکری انحراف کا مظاہرہ کرتے ہوئے برملا بول اٹھا کہ وہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے جو مٹی سے برتر ہے، بھلا برتر، کمتر کو کیوں کر سجدہ کر سکتا ہے۔ یہ فکری انحراف اور حکم ربانی کے مقابلہ میں قیاس فاسد کی پہلی مثال تھی جو شیطان لعین نے پیش کی۔ جس کے باعث وہ راندہ درگاہ اور دائمی لعنت کا شکار ہوا۔

اعتدال اور وسطیت کی راہ کو چھوڑ کر ایسی راہ اختیار کرنا جو دین، فرد اور معاشرے کے لئے ضرر رساں ہو؛ فکری انحراف کہلاتا ہے۔ دنیا میں فساد وبگاڑ کا کوئی بھی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کے پیچھے یہی فکری کج روی پنہاں ہوتی ہے، فکری انحرافات نے دنیا میں فساد وبگاڑ کے پھیلاؤ میں کیا رول ادا کیا ہے؛ اگر ہم تاریخی اعتبار سے اسکا جائزہ لیں تو یہ مضمون خاصا طویل ہو سکتا ہے۔ تاہم اسکی سنگینی کو واضح کرنے کے لئے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر کے اس کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں:

فکری انحراف اسلام کی آمد سے پہلے:

دنیا میں شرک و بت پرستی پھیلنے کے اسباب وعلل کو تلاش کرنے پر یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ انسانوں نے خالق کائنات کی عبادت وبندگی چھوڑ کر، اصنام واوثان کو اسی وقت اپنا معبود بنایا جب انکے انداز فکر میں کجی آئی ورنہ نوح علیہ السلام کی قوم سے پہلے دس صدیوں تک لوگ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خالص عبادت اور اس کی وحدانیت پر قائم تھے، اللہ تعالی فرماتا ہے، "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ"۔[1] شیطان نے جب نوح علیہ السلام کی قوم

---

(۱) [البقرۃ: ۲۱۳].

کو صلحاء پرستی کے جال میں پھنسایا تو سب سے پہلے انکی برین واشنگ کی اور انکے انداز فکر کو بدلا اور پھر اگلے مرحلے میں آسانی سے انہیں شرک کے دلدل میں دھکیل دیا، اور یوں دنیا میں اللہ کو چھوڑ کر معبودان باطلہ کی پرستش کا آغاز ہوا۔

بنی اسرائیل میں فکری انحرافات:

بنی اسرائیل کی تاریخ کا جب ہم بغور جائزہ لیتے ہیں تو جا بجا ہمیں انکی فکری کج روی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ فرعون اور اس کے لشکر کی غرق آبی کے بعد جب بنی اسرائیل بدترین قسم کے عذاب سے نجات پاگئے، تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے شکر گزار ہوتے، لیکن انکی فکری انحطاط اور ناشکری کی بدترین مثال دیکھئے کہ جیسے ہی وہ مصر سے نکلے اور مشرک قوم سے انکا سامنا ہوا، انہوں نے فوراً حضرت موسی علیہ السلام سے اپنے لئے معبود مقرر کردینے کی مانگ کی: "اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ"۔[1] "ہمارے لئے معبود مقرر کردیں جیسے ان لوگوں کے لئے ہے۔ موسی علیہ السلام نے کہا کہ تم جاہل لوگ ہو"۔

انکے فکری انحرافات سے موسی علیہ السلام ہمیشہ پریشان رہے، انکی کج روی کی مثالیں سورہ بقرہ، اعراف، یونس اور طہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حضرت موسی علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے انبیا اور رسولوں میں سے بہت سوں کو قتل کیا اور دیگر تمام کو اذیتیں دیں، حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے درپے ہوئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف جسم وروح کے ساتھ زندہ اٹھالیا تو انکی ذات میں افراط و تفریط کا ایسا مظاہرہ کیا جس نے انکی فکری زبوں حالی اقوام عالم کے سامنے واضح کردی۔ نصاری میں کسی نے نعوذ باللہ انہیں اللہ کہا، تو کسی نے اللہ کا بیٹا اور کسی نے انہیں تین خداؤں میں سے ایک گردانا، جبکہ غضب الہی کی شکار قوم یہود نے انہیں ولد الزنا تک کہہ دیا۔ قاتلهم الله أنى يؤفكون—

فکری انحراف اسلام کی آمد کے بعد:

(الف)- عہد نبوت: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے فورا بعد سے صحابہ کرام کی اخلاقی، روحانی اور فکری تربیت کا آغاز کردیا تھا۔ جب آپ کو صحابہ کرام میں سے کسی کی فکر کے اندر بے اعتدالی کی جھلک دکھائی دیتی، آپ فورا انکی اصلاح فرماتے، سیرت طیبہ میں ایسی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دعوت دین میں جلد بازی سے بچنے کی تلقین:

(۱)- جب مکہ میں مسلمانوں پر قریش کی ایذا رسانیاں سخت ہوگئیں اور مسلمان مصیبتوں میں گھر گئے، تو انہوں نے فورا اللہ سے قریش کے خلاف التجائیں کیں، جن میں قریش کے خلاف عذاب کی التجا بھی تھی، اللہ سبحانہ وتعالی کو مسلمانوں

---

(۱) [الأعراف: ۱۳۸].

کا یہ استعجال پسند نہیں آیا، ہونا تو چاہیے تھا کہ مسلمان ان مصائب ومشکلات پر صبر کرتے لیکن وہ اپنے اعدا کے خلاف عذاب کے نزول کے خواہشمند ہوگئے۔ اللہ کہتا ہے: "اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَه مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ"۔[1] "کیا تم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے"۔

خود پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی سرزنش کی جب وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قریش کی ایذا رسانیوں کی شکایت کرنے آئے اور آپ سے یہ فریاد کی کہ آپ اللہ سے قریش کے خلاف مدد کی دعا فرمائیں آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ تھے ان میں اہل ایمان کی یہ شان تھی کہ جب وہ اپنے ایمان سے پھر جانے سے انکار کر دیتے تو ان میں سے کسی کو زمین میں گاڑ کر آرے سے دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، یا اسکے جسم کے گوشت کو، لوہے کی کنگھیوں سے الگ کر دیا جاتا پھر بھی ان کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آتی تھی۔ اللہ کی قسم اللہ اپنے اس دین کی تکمیل کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے سوائے اللہ کے، اور اپنی بکریوں پر سوائے بھیڑیوں کے کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم لوگ جلد بازی کر رہے ہو۔[2]

جب بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصاری صحابی عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنی تلواروں کے ساتھ اہل منی (قریشیوں) پر ٹوٹ پڑیں، آپ نے سختی سے انہیں منع فرمایا اور کہا کہ اپنے خیموں کی طرف لوٹ جاؤ۔[3]

ان دو واقعات پر اگر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں صحابی کی تجاویز پر عمل درآمد کی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے کیا کیا پریشانیاں اٹھ کھڑی ہوتیں، ان کا ادراک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح سے تھا اسلئے انکی تجاویز کو رد کر کے انکے انداز فکر کو آپ نے صحیح سمت دی، اور دین کی نشر واشاعت میں صبر و تحمل کی اہمیت کو انکی نگاہوں کے سامنے واضح انداز میں رکھا، اس قسم کی مثالیں ہمیں مدنی دور میں بھی ملتی ہیں جنگ احد میں مسلمانوں کو جن نقصانات سے دوچار ہونا پڑا اسکی واحد وجہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب سے جلد بازی میں قائم کی جانے والی رائے تھی کہ مشرکوں کو شکست ہوگئی ہے اور اب ہمیں اس پہاڑی کی حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ

---

(۱) [البقرۃ: ۲۱۴]۔

(۲) (صحیح بخاری: ۶۹۴۳)۔

(۳) (مسند احمد: ۱۵۷۹۸ والبیھقی فی دلائل النبوہ: ۴۴۹/۲)۔

وسلم نے ہمیں متعین فرمایا تھا۔ حتی کہ عبادات کے باب میں بھی جب بعض صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو کم گردانتے ہوئے اپنے آپ کو بعض عبادت کا سخت پابند کرنا چاہا تو نہ صرف آپ نے انکی شدت پسندی پر ان کی زبردست سرزنش کی بلکہ اپنے آپ کو انکے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیا۔ (۱)

ایک بار صحابہ کرام تقدیر کے مسئلے پر آپس میں بحث ومباحثہ کررہے تھے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب آپ نے تقدیر جیسے مہتم بالشان مسئلے پر جھگڑتے دیکھا تو آپ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہوگیا اور آپ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: میں تمہیں تقدیر کے مسئلے پر بحث ومباحثہ سے سختی سے منع کرتا ہوں۔ (۲)

اس تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر صحابہ کرام نے اس مسئلے پر لب کشائی کرنے سے نہ صرف گریز کیا بلکہ بعد میں لوگوں کو اس مسئلے پر بحث ومباحثہ کرنے سے روکا اور انکے انداز فکر کو صحیح راہ دی۔ صحیح مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جب ان کے پاس یحی بن یعمر اور عبدالرحمٰن حمیری آئے اور ان سے کہا کہ: ہمارے علاقے میں (عراق کے شہر بصرہ میں) کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں (معبد جھنی اور انکے ہمنوا)، تو ابن عمر نے کہا: کہ جب تم لوٹ کے جانا تو انہیں کہہ دینا کہ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابن عمر کی جان ہے اگر ان میں سے کسی کے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، تو اس وقت تک اللہ اسے قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہیں لاتا۔۔۔ پھر انہوں نے اپنے والد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو حدیث جبریل سے جانی جاتی ہے، سنائی۔ (۳)

---

(۱) (صحیح بخاری: ۵۰۶۳)۔

(۲) (حسنہ الالبانی فی صحیح الترمذی: ۲۱۳۳)۔

(۳) (صحیح مسلم، کتاب الایمان حدیث: ۱)۔

انکار سنت کے متعلق چند گزارشات

ابواحمد کلیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

منکرین سنت کا ظہور نشان نبوت کا حصہ ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق پہلے پیشن گوئی کی تھی اور ان کی بعض صفات کا ذکر بھی کیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((ألا إني أوتيت الكتاب ومثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه ألا لا يحل لكم لحم الحمار الأهلي ولا كل ذي ناب من السبع ولا لقطة معاهد إلا أن يستغني عنها صاحبها ومن نزل بقوم فعليهم أن يقروه فإن لم يقروه فله أن يعقبهم بمثل قراه)).[1]

ترجمہ: سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "خبردار! مجھے قرآن کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز بھی دی گئی ہے۔ عنقریب ایسے ہوگا کہ ایک پیٹ بھرا (آسودہ حال) آدمی اپنے تخت یا دیوان پر بیٹھا کہے گا کہ اسی قرآن کو اختیار کرلو، جو اس میں حلال ہے اسے حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھو۔ خبردار! تمہارے لیے پالتو گدھے، نیش دار درندے اور کسی ذمی (کافر) کا گرا پڑا مال اٹھالینا حلال نہیں، الا یہ کہ اس کا مالک اس سے بے پرواہو۔ اور جو کوئی کسی قوم کے پاس جائے تو ان پر واجب ہے کہ اس کی مہمانی کریں، اگر وہ اس کی مہمانی نہ کریں تو اسے حق حاصل ہے کہ اپنی مہمانی کے مثل ان سے بذریعہ طاقت حاصل کرلے۔"

ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ نے کچھ یوں فرمایا: ((لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به ونهيت عنه، يقول: لا أدري، ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه)).[2]

---

(۱) ابوداؤد (۴۶۰۴)، ترمذی (۲۶۶۴) حسن۔
(۲) ابوداؤد (۴۶۰۵)، ترمذی (۲۶۶۳). حسن۔

ترجمہ: سیدنا ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہرگز ایسا نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں پاؤں کہ وہ اپنے تخت یا دیوان پر بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے، جس کا میں نے حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو تو وہ کہنے لگے کہ ہم نہیں جانتے، ہم تو کتاب اللہ میں جو پائیں گے، اسی پر عمل کریں گے۔"

إعداء اسلام شروع سے اس فراق میں تھے کہ کب موقع ملے اور فتنے کا آغاز کیا جائے، ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں ان کے عزم وحزم کی وجہ سے ممکن نہیں ہو سکا، اسی طرح عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ان کی حکیمانہ سیاست کی وجہ یہ لوگ اپنے افکار باطلہ کی ترویج میں ناکام رہے، لیکن عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد گویا کہ فتنے کے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے ہوں، نت نئے خطرناک قسم کے فتنے جنم لینے لگے، فتنوں کی اس سوداگری کے پیچھے یہود وفلاسفہ کا ہاتھ تھا، جن لوگوں نے اس دور میں ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سنت مطہرہ کے خلاف شکوک وشبہات پھیلانے شروع کئے ان میں:

عبد اللہ بن سبا (یہودی)، سوسن نصرانی جس سے معبد الجہنی نے تقدیر کے انکار کی بدعت سیکھی، ابراہیم النظام المعتزلی، بشر المریسی اور جہم بن صفوان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہ اور ان کے پیروکاروں نے سنت کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اور **سنت کے انکار کے کئی طریقے ایجاد کئے**، جن میں سے:

۱- عقل کو بنیاد بنا کر سنت کا انکار کرنا۔

۲- حدیث کے راویوں میں بلاوجہ عیوب نکالنا اور جھوٹی تہمت لگانا۔

۳- جھوٹی احادیث اپنی طرف سے بنالینا تاکہ ائمہ حدیث کے اوپر الزام لگایا جاسکے۔

خوارج اور روافض نے احادیث کو رد کرنے میں پہل کی، خوارج نے ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مرویات کو ماننے سے انکار کردیا جنہوں نے جنگ صفین میں ثالثی سے رضامندی ظاہر کی۔

اور رافضیوں نے چند ایک صحابہ کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرام کی احادیث کو ماننے سے انکار کردیا، کیوں کہ ان کے نزدیک علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے لیکن نعوذ باللہ ابو بکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان کے حق کو غصب کرلیا اور ان پر زیادتی کی۔

پھر دوسری صدی ہجری میں یونانی اور فارسی کتابوں کے عربی ترجمہ نے فساد برپا کر دیا، یہ کتابیں منطق و فلسفہ سے بھری ہوئی تھیں، اسی منطق و فلسفہ کے سہارے بعض بد دین احادیث کو نشانے بنانے لگے، اور اس کی حجیت کو مشکوک کرنے سعی میں مصروف ہو گئے، جیسے نظام معتزلی، ابو الہذیل العلاف اور محمد بن جہم البرمکی وغیرہ، یہ سنت میں تشکیک پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دین کا اور اسلامی شعائر کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔

سنت کا مطلق انکار کرنے والے کا وجود ہر زمانے میں رہا ہے، البتہ فرقے کی شکل میں ان کا وجود انیسویں اور بیسویں صدی میں آیا، برصغیر میں عبد اللہ چکڑالوی، احمد الدین امرتسری اور غلام احمد پرویز نے اس فکر پروان چڑھایا، چنانچہ عبد اللہ چکڑالوی نے لاہور ایک فرقے کی بنیاد "فرقہ اہل القرآن" کے نام سے رکھی، ہندوستان میں احمد الدین امرتسری نے فرقہ "امت مسلم" کی بنیاد رکھی، اور غلام احمد پرویز نے "طلوع اسلام" کی بنیاد ڈالی اور اس کے ماننے والے پرویزی کہلائے۔

مصر میں محمد عبدہ، توفیق صدقی، ابو ریہ وغیرہ نے سنت سے بیزاری کا بالکل یہ اعلان کیا، اور قرآن اکیلا ہی کافی ہے کا نعرہ لگایا۔

شبہات پر رد کرنے کے بعض اصول و ضوابط:

شبہ کسے کہتے ہیں: دو متشابہ چیزوں کے مابین فرق نہ کر پانے کو شبہ کہتے ہیں، یعنی باطل پر حق کا رنگ چڑھا کر ایسا پیش کیا جائے کہ وہ بظاہر حق لگے، لیکن جب اسے کی جانچ پڑتال کی جائے تب جا کر اس کی حقیقت سے پردہ اٹھے۔

شبہ کے ازالہ کی اہمیت: شبہات کا ازالہ کرنا اصول دین کا حصہ ہے، کیونکہ اللہ رب العالمین نے مشرکین پر رد کرتے ہوئے ان کے شبہات کی تار پود بکھیر کر رکھ دی ہے، اللہ رب العالمین نے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا اسْتُجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ﴾۔[1]

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں جھگڑا ڈالتے ہیں اس کے بعد کہ (مخلوق) انہیں مان چکی ان کی خواہ مخواہ کی حجت اللہ کے نزدیک باطل ہے اور ان پر غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

---

(۱) [الشوری: ۱۶].

اہل باطل اور بدعتیوں پر رد کرنا ایک قسم کا جہاد ہے، اللہ رب العالمین میں مکی دور میں کفار پر رد کرنے کو جہاد سے تعبیر کیا ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿فَلا تُطِعِ الكافِرينَ وَجاهِدهُم بِهِ جِهادًا كَبيرًا﴾۔ (۱)

ترجمہ: پس آپ کافروں کا کہنا نہ مانیں اور قرآن کے ذریعے ان سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں۔

اہل باطل کے شبہات پر رد کرنا اور حق بیان کرنا فرض کفایہ ہے، اور فرض کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ: بعض لوگ اگر اس عمل کو انجام دیں تو سب کی جانب سے وہ ذمہ داری ادا ہو گی، لیکن اگر کسی نے اس عمل کو انجام نہیں دیا تو پھر سب کے سب گنہ گار ٹھہریں گے، مثال کے طور پر کسی مجلس بعض صحابی کہ شان میں گستاخی کی گئی اور سب لوگ خاموش رہے، مجلس ختم ہو گئی اور کسی ایک نے بھی اس صحابی کا دفاع نہیں کیا تو اس مجلس کے سب کے سب لوگ گنہ گار ٹھہریں گے، اور اگر اسی مجلس میں کسی ایک نے اس پر رد کر دیا اور اس صحابی کا دفاع کر دیا تو سب کے سب لوگ گناہ سے بچ جائیں گے۔

جن اسباب کی بنیاد پر شبہات وجود میں آتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- جہالت۔

۲- ہر چیز میں عقل کو داخل کرنا۔

۳- ہوائے نفس کی پیروی کرنا۔

یاد رہے کہ شبہ کی حیثیت بیماری کے جیسی ہے اس لئے جس طرح بیماری کو لوگوں کے مابین پھیلانا عقل و دانش کے خلاف ہے اسی طرح شبہ کو بھی عوام کے درمیان نشر کرنا عقل و دانش کے خلاف ہے۔

بعض سلف نے بدعت اور اہل بدعت کو اس شخص سے تشبیہ دی ہے جسے خارش کی بیماری ہوتی ہے، اور ہمہ دم یہ خطرہ منڈلاتا رہتا ہے کہ یہ جس کی صحبت اختیار کرے گا اسے یہ بیماری سرایت کر جائے گی، کیوں کہ شبہ دل کے امراض میں سے ایک مرض ہے، نیز شبہ بدعت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جبکہ بدعت کفر کی طرف، اس لئے بدعت اور اہل بدعت سے دوری بنائے رکھنا ضروری ہے، اور جو لوگ ان بدعات پر رد کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں انہیں رد کرنا چاہیے۔

---

(۱) [الفرقان: ۵۲].

شبہات کی تردید سے قبل جن ضوابط کی آگہی ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

پہلا ضابطہ: شبہات پر رد وہی کریں جن کے پاس کتاب و سنت، اقوال سلف صالحین کا گہرا علم، فہم و فراست اور ذہانت و فطانت ہو، ہر کوئی شبہات پر رد کرنے کی کوشش نہ کرے، کیونکہ اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔

دوسرا ضابطہ: جو شبہ لوگوں کے درمیان رواج پا چکا ہو، احقاق حق اور ابطال باطل کیلئے اس پر رد کرنا اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کرنا ضروری ہے، تاہم جس شبہ کو لوگ جانتے ہی نہ ہوں، اس پر رد کرنا درست نہیں، گرچہ وہ کسی زمانے میں لوگوں کے درمیان رائج رہا ہو، اور علمائے کرام نے اس پر رد بھی کیا ہو، لیکن جب ہمارے زمانے اور معاشرے میں عوام اس شبہ کو نہیں جانتی تو اس کا ذکر کرنا اور پھر اس پر رد کرنا درست نہیں۔

تیسرا ضابطہ: بعض اہل علم کہتے ہیں کہ شبہات پر رد کرنے سے قبل "حق کی تاصیل" ضروری ہے، یعنی عوام الناس کو عقیدہ توحید سے روشناس کرایا جائے، اسلامی عقیدہ بیان کرکے ان کے اندر پختگی پیدا کی جائے، تاکہ جب باطل پر رد کیا جائے تو انہیں حق و باطل کی تمییز ہو سکے۔

چوتھا ضابطہ: رد علمی اور قوی ہو، کتاب و سنت کے دلائل اور اقوال سلف صالحین سے مبرہن ہو جس سے باطل پرست کے شبہات کی تار و پود بکھر کر رہ جائے، لوگوں کیلئے رہنمائی کا ذریعہ بنے، نیز جذبات کے بجائے دلائل اور اس سے صحیح استدلال پر زور دیا جائے۔

پانچواں ضابطہ: شبہات پر رد کرنے میں کہاں تفصیل سے کام لینا ہے اور کہاں مختصر انداز میں رد کرنا ہے، اس کا علم بھی نہایت ضروری ہے، نیز مصلحت و مفسدت کا خیال رکھنا ان تمام پر مقدم ہے۔ اجمال و تفصیل کے تعلق سے دو اہم ضابطے یاد رکھیں:

ا۔ شبہات کو سرسری اور نہایت مختصر انداز میں اس وقت ذکر کیا جائے گا جب اس کے مخاطب عوام ہوں، نیز کتاب و سنت اور سلف صالحین کے اقوال سے اس شبہ پر رد اسی انداز میں کیا جائے گا جو عوام کی سمجھ میں آسکے۔

ب۔ شبہات کو تفصیلاً ذکر کرکے اس پر مفصل انداز میں اس وقت رد کیا جائے گا جب اس کے مخاطب اہل علم اور اہل فن ہوں، نیز غالب گمان یہ ہو کہ اس رد پر اہل علم ہی مطلع ہوں گے، یا اس رد کے مخاطب اہل زیغ و ضلال اور گمراہ ہوں۔

چھٹا ضابطہ: جیسے ہی اہل باطل شبہات پھیلانے کی شروعات کریں فوراً اسی وقت اہل علم کو ان شبہات پر رد کرنا چاہیے، تاخیر درست نہیں ہے، کیونکہ جب شبہ پر فوراً رد نہیں کیا جائے گا تو عوام اس سے متاثر ہوگی، ایک اور بات کا اضافہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ: کسی مجلس میں، یا سوشل میڈیا کے کسی گروپ میں یا کسی اور مقام پر صرف شبہ ذکر کرکے خاموش ہونا جائز نہیں، چنانچہ سوشل میڈیا پر بعض پوسٹ کچھ اس انداز کی ہوتی ہیں:

کچھ لوگ اسلام کے بارے میں ایسا ایسا کہتے ہیں!!

کچھ لوگ فلاں حدیث کا یہ کہہ کر انکار کرتے ہیں!!

کچھ لوگ فلاں صحابی کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے ہیں!!! وغیرہ وغیرہ۔

بلکہ شبہات ذکر کرنے کے بعد فوراً ان کا رد کرنا چاہئے، یا اسے استفہامیہ انداز میں پوچھنا چاہئے، اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ عوام الناس کے سامنے اس کا ذکر کرنے کے بجائے اہل علم کے ساتھ الگ سے بیٹھ کر اس قسم کے شبہات کا جواب معلوم کیا جائے، الا یہ کہ وہ شبہ عوام کے درمیان رائج پا چکا ہو اور اس کی تردید ناگزیر ہو تو ایسی حالت میں سب کے سامنے پوچھا جا سکتا ہے۔

پھر آپ ہمارے اکابر علماے اہل حدیث کے منہج پر اعتراض کیوں نہیں کرتے؟

فاروق عبداللہ نراین پوری
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

آج جب "**منہج سلف**" کی روشنی میں کسی پر رد کیا جاتا ہے تو بعض حضرات بڑی خوبصورتی سے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے بر صغیر کے اکابر علماے اہل حدیث کے یہاں بھی تصوف اور اسما وصفات وغیرہ کے ابواب میں خلل موجود ہے، اگر آپ حضرات اِن پر کلام کرتے ہیں تو بر صغیر کے اکابر علماے اہل حدیث کے منہج پر بھی اسی طرح اعتراض کریں۔

سب سے پہلے ایسے حضرات سے یہ کہنا ہے کہ آپ یہ فیصلہ کریں کہ اسما وصفات اور عقیدہ و منہج کے دیگر ابواب میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ حق و باطل کی صحیح تمیز کے بعد ہی آپ کے لئے اس پر عمل کرنا ممکن ہوگا، اگر یہ تمیز ہی آپ کے پاس نہیں ہوگی تو کبھی آپ ہمیشہ تذبذب کے شکار رہیں گے۔ نتیجتا کبھی اِس ڈال پر ہوں گے، اور کبھی اُس ڈال پر۔

یہ اللہ تعالی کی سنت رہی ہے کہ ہمیشہ ہر دور میں ایک جماعت ایسی موجود ہو جو بلا خوف لومۃ لائم حق پر قائم ودائم ہو، ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام لوگ باطل کی اتباع کریں، اور حق ہر ایک سے مخفی رہ جائے۔ یوں تو حق پر ہونے کے دعویدار سبھی ہوتے ہیں، البتہ ان میں سے صرف ایک ہی گروہ حق پر ہوتا ہے، تمام نہیں، کیونکہ حق متعدد نہیں ہوتا۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے "احکام اہل الذمہ"[1] میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، فرماتے ہیں کہ: اس امر پر چالیس دلائل ہیں کہ حق صرف ایک ہوتا ہے، متعدد نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مَا الْحَقُّ إِلَّا وَاحِدٌ، قَوْلَانِ مُخْتَلِفَانِ لَا يَكُونَانِ صَوَابًا جَمِيعًا، مَا الْحَقُّ وَالصَّوَابُ إِلَّا وَاحِدٌ''۔ (حق صرف ایک ہے، دو مختلف اقوال ہوں تو کبھی بھی دونوں بر حق نہیں ہو سکتے، حق اور درست صرف ایک قول ہے۔)۔[2]

---

(۱) (۱/۳۲-۳۰)۔

(۲) «جامع بيان العلم وفضله» لابن عبد البر (۲/۹۲۲).

اجتہادی مسائل میں اختلاف کا واقع ہونا اور ایک ہی مسئلہ میں کئی کئی متضاد اقوال کا پایا جانا عین ممکن ہے، لیکن ان اقوال میں سے مبنی بر حق قول صرف ایک ہی ہوگا، باقی دیگر اقوال برحق نہیں ہو سکتے، الا یہ کہ ان میں جمع و تطبیق کی کوئی صورت پیدا ہو جائے یا دلائل اس خاص مسئلہ میں وسعت پر دال ہوں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ : اس کی مثال اس طرح ہے کہ اگر قبلہ کی تعیین میں اختلاف واقع ہو جائے تو متعدد اقوال ہونے کے باوجود قبلہ کی صحیح جہت صرف ایک ہی ہوگی، کئی ایک نہیں۔[1]

اجتہادی مسائل میں کسی مجتہد نے اگر سچی نیت سے کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں اجتہاد کیا ہے اور حق کی موافقت سے چوک گئے، ایسی صورت میں انہیں ان کے اجتہاد کی بناپر ایک اجر سے نوازا جائے گا۔ البتہ اگر ان کا قول حق کے موافق ہوتا تو وہ دو اجر کے مستحق ہوتے۔

کوئی بھی انسان غلطیوں سے پاک نہیں، یہ صرف ذات باری تعالی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر طرح کے عیوب ونقائص سے پاک ہے، انبیا سے بھی غلطیوں صدور ممکن ہے لیکن اللہ تعالی انھیں غلطیوں پر باقی نہیں رکھتا، ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ جبکہ دیگر انسانوں سے غلطیوں کا صدور امر لازم ہے، لہٰذا ہمارے پاس مسئلہ کی صحیح معرفت کا ہونا بہت ضروری ہے، اگر مسئلہ کی صحیح معرفت ہوگی تو کسی بھی شخصیت کو پڑھتے ہوئے بتقاضاے بشریت ان سے سرزد ہوئی غلطیوں میں ان کی تقلید سے محفوظ رہیں گے، ورنہ عقیدت کے جال میں پھنس کر، غلطیوں میں بھی ان کی تقلید کا شکار ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔

اس مقدمہ کو سمجھنے کے بعد اب برصغیر کے اکابر علماے اہل حدیث کی طرف آئیں۔ سب سے پہلے آپ یہ فیصلہ کریں کہ جن مسائل میں آپ اکابرین کو بطور ڈھال استعمال کر رہے ہیں خود آپ کے نزدیک ان کا موقف ان مسائل میں صحیح ہے یا غلط؟

اگر آپ بھی مانتے ہیں کہ ان کا موقف صحیح نہیں تھا تو کیا یہ انصاف ہے کہ ان مسائل میں بھی ان کا دفاع کیا جائے؟ یا ان کو اپنی ڈھال بنائی جائے؟ کیا تاریخ میں یہ مذکور نہیں کہ اسی زمانے میں بعض علما سے جب ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں تو دیگر اکابرین نے ان پر کلام کیا؟

---

(۱) (احکام اہل الذمہ ۱/۳۲)۔

اب یہ سوال کہ "اگر آج اِن مسائل کی وجہ سے کسی کی سلفیت اور منہج پر کلام کیا جاتا ہے تو اُن اکابرین کی سلفیت پر کوئی کلام کیوں نہیں کرتا؟"

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل حق ہر زمانے میں اہل باطل سے ممتاز اور الگ تھلگ رہے ہیں، ہر زمانے میں ماحول کے حساب سے بعض خاص مسائل معروف رہے ہیں جن کے ذریعہ اہل حق اور اہل باطل کے مابین تفریق کیا جاتا رہا ہے۔

اسی وجہ سے بعض ایسے مسائل بھی ہمیں کتب عقائد میں نظر آتے ہیں جو خالص فقہی ہیں، اعتقادی نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے زمانے میں اہل حق و باطل کے مابین تمیز کے لئے وہ مسئلہ ایک علامت بن چکا تھا اس لئے اس دور کے علما نے اعتقادی مسائل کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کتب عقائد میں کیا۔ مثلاً **"مسح علی الخفین کا مسئلہ"** اہل سنت اور روافض کے مابین امتیاز کی حیثیت رکھتا تھا، لہٰذا موزے پر مسح کے مسئلہ کو کتب عقائد میں ذکر کیا گیا، حالانکہ یہ ایک خالص فقہی مسئلہ تھا۔

اسی طرح آج کے برصغیر کے ماحول میں مقلدین اور سلفیوں کے مابین تمیز کے لئے رفع یدین، سینے پر ہاتھ باندھنا اور آمین بالجہر جیسے خالص فقہی امور امتیازی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی رفع یدین نہیں کرتا، ناف کے نیچے ہاتھ باندھتا ہے تو یہ اس کے منہج میں بگاڑ ہونے کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور آپ جب گہرائی سے اس شخص کی تحقیق کریں گے تو پائیں گے کہ اس کے اندر اور بھی بے شمار منہجی انحرافات موجود ہیں، الا ماشاء اللہ۔

جہاں تک بارہویں و تیرہویں صدی ہجری کے ہندوستان کی بات ہے تو اس وقت کے اکابر علماے اہل حدیث کی خدمات "احیاءِ سنت اور ترک تقلید" کے لئے معروف ہے نہ کہ اسما و صفات اور ان کے ہم مثل ابواب میں منہج سلف کی تنقیح اور ترویج و اشاعت کے لئے۔

ولی اللہی خاندان نے جس جانفشانی سے خطے میں شرک و بدعت پر کام کیا جماعت اہل حدیث ان کا احسان مند ہے، اور اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ بھی یقیناً انتہائی لائق تحسین ہیں، لیکن ان کے یہاں عقیدے اور منہج (خصوصاً اسما و صفات کے باب میں) کی مکمل تنقیح نہیں ملتی، بلکہ بہت ساری تصنیفات میں ماتریدی اور متصوفانہ افکار کی نمائندگی ملتی ہے۔ چنانچہ اہل علم نے ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود ان کے مذکورہ موقف پر تنقید کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ یہ فکر کتاب وسنت سے متصادم ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۶۷ھ) نے جب "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" لکھی، اور دیگر بعض مسائل کے ساتھ "استواء علی العرش" کے مسئلہ میں تاویل کا طریقہ اپنایا تو برصغیر کے ہی ان کے معاصرین سلفی

علماے کرام نے اُن کی اِن غلطیوں پر خوب ردود لکھے، ان میں سب سے زیادہ پیش پیش تین علما تھے: مولانا عبد الجبار غزنوی امرتسری رحمہ اللہ، مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ، اور مولانا احمد اللہ امرتسری رحمہ اللہ۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے بھی ان کا جواب لکھا، جب معاملہ طول پکڑنے لگا تو مدرسہ احمدیہ سلفیہ آرہ کے سالانہ اجلاس میں ملک کے اکثر کبار سلفی علما کے باہمی مشورے سے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کمیٹی کے معزز ارکان تھے: مولانا حافظ عبد اللہ غازی پوری، صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق ڈیانوی، اور مولانا شاہ عین الحق پھلواری رحمہم اللہ۔ ان علما نے بھی تقریبا چودہ مسائل میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ پر رد کو درست ٹھہرایا۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے صفت استواء کی تاویل کرتے ہوئے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا: "الفتوی علی تاویل الاستواء"، جس کے جواب میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے سنہ ۱۳۴۷ھ میں (یعنی مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی وفات سے تقریبا بیس سال قبل) ایک شاندار رسالہ لکھا، جس کا نام تھا: ''الاهتداء بالاكتفاء بتفسير الاستواء''۔[1]

الغرض ہمارے بر صغیر کے کبار سلفی علما نے بھی ردود کے باب میں اسی منہج کو اختیار کیا ہے جس پر سلف صالحین گامزن تھے، اور جس پر آج کے سلفی علما بھی الحمد للہ چل رہے ہیں۔

اگر دو صدی پہلے تقلیدی انحراف سے مقابلہ کے لئے سلفی و غیر سلفی کے مابین تقلید کا مسئلہ امتیازی حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے تو اس زمانے میں دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ؛ سلفی فکر کے مخالف جنم لینے والی اخوانی فکر اور ان کے منحرفانہ عقائد و افکار سلفی اور غیر سلفی کے درمیان امتیاز کا سبب کیوں نہیں بن سکتے؟

الحمد للہ! آج کے زمانے میں سلفی علما؛ اخوانی فکر اور اس کے حاملین سے امت کو مسلسل آگاہ کر رہے ہیں، جو کہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

---

(۱) عنقریب یہ کتاب ہمارے ایک دوست کی تحقیق، اور علامہ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کے شاندار علمی مقدمے کے ساتھ چھپنے والی ہے، اللہ کے فضل سے مجھے پوری کتاب پڑھنے کی سعادت حاصل ہے، اور فضیلۃ الشیخ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کے مقدمہ سے ہی اکثر یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

لہٰذا آج کے ماحول میں عالم اسلام میں اخوانی فرقے، اور ان کے فتنہ وفساد کے ظہور کے بعد کوئی ان کے باطل افکار کی نشر واشاعت کرنا چاہے اور ان کے منہج پر اعتراض ہونے پر بارہویں وتیرہوں صدی ہجری کے اکابر اہل حدیث پر اپنا قیاس کرے اور ان کے دامن میں اپنا جرم چھپانا چاہے تو اسے نہ اس کی اجازت مل سکتی ہے، اور نہ ہی کامیابی۔

کیا مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) مختلف فیہ مسئلہ ہے؟ (قسط اول)

حافظ علیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

اہل حدیث اور سلفیوں کے نزدیک کسی مسئلے میں جب قرآن و حدیث سے دلیل مل جائے تو اس کی مخالفت جائز نہیں ہے، اور مختلف فیہ مسائل میں ترجیح اس رائے کو دی جاتی ہے جس کی صحت پر شرعی دلائل موجود ہوں، فقہی مسائل میں ہم بڑے شد و مد کے ساتھ اس قاعدے پر عمل پیرا ہیں، البتہ عقدی و منہجی امور میں بعض اہل حدیثوں کے نزدیک دلائل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، انہیں قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ زیر بحث مسئلے میں کتاب و سنت کس بات پر دلالت کرتے ہیں، بلکہ کسی شاذ قول یا کسی کے عمل کو نص قرآنی کے مثل بطورِ حجت پیش کر رہے ہوتے ہیں، ان کے سامنے جب دلائل دلائل پیش کئے جاتے ہیں تو ان سے اعراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، جبکہ اصول فقہ کا مبتدی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ دلیل شرعی کے مخالف قول و عمل کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ اس شخص کو اپنے ایمان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو واضح اور صریح نصوص کے سامنے کسی عالم کا قول و عمل پیش کرے، اور ساتھ یہ بھی کہتا پھرے کہ: "میری بھی یہی رائے ہے"۔ نیز یہ کہ ہر اختلاف معتبر نہیں ہوتا، خصوصاً جب دوسرا قول دلائل سے عاری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علما نے حائضہ عورتوں کی نماز اور روزوں کی قضا سے متعلق بعض خوارج کے اختلاف کو لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا اور نہ ہی انہیں قابل ذکر سمجھا۔

اگر مختلف فیہ مسائل میں دلائل کے ساتھ ساتھ اجماع امت بھی وارد ہوا ہو تو اس کی مخالفت گمراہی کا موجب ہوتی ہے، اجماع کے تعلق سے یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اجماع کسی بھی زمانے میں ہو سکتا ہے، اور وہ اپنے بعد کے زمانوں کے لئے حجت ہوگا۔ ظالم اور فاسق و فاجر مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا اور اعلانیہ طور پر ان کی غلطیاں یا ان کے گناہوں کو بیان کرنا شرعاً حرام اور ناجائز عمل ہے، کتب احادیث میں اس سے متعلق بکثرت نصوص وارد ہیں۔

صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا خالص دین مکمل امانت داری کے ساتھ امت تک پہنچایا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت تمام عقائد اسلام کا حقیقی چہرہ اور قرآن و حدیث کی درست تعبیر ہے، جس میں نصوص کتاب و سنت کا التزام اور انحراف سے نجات ہے۔

ان کے بالمقابل اہل بدعت ہیں، جنہوں نے کتاب و سنت پر اپنی ناقص وکج فہم عقل کو فوقیت دی اور دلائل سے روگردانی کرتے ہوئے دین میں نت نئی بدعات ایجاد کی، باطل تاویل و تحریف کا سہارا لے کر مختلف اقسام کی بدعات کو وجود بخشا۔

ان کے باطل افکار کی تردید کے لئے اللہ رب العالمین نے اس امت میں ایسے علما کو پیدا کیا جنہوں نے تمام منحرفانہ افکار کی خوب خوب خبر لی ہے، اور امت کو ان کے فتنوں سے باخبر کیا ہے۔

سلف صالحین کی کتابیں انحراف سے بچاؤ اور جادہ حق کی صحیح راہنما ہیں، اہل بدعت کے خلاف کاٹ دار تلوار اور برق آسمانی کے مثل ہیں۔ انہوں نے اہل سنت کے عقائد کی بھی توضیح کی ہے اور اہل بدعت کے فاسد عقائد کی تردید بھی، اہل حق کی نشانیاں بھی بتائی ہیں اور منحرفین کا پردہ بھی فاش کیا۔ وللہ الحمد والمنہ۔

حاکم کے خلاف خروج کا مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ایک ہے جسے سلف صالحین نے اہل سنت کے خصوصی اعتقاد میں ذکر کیا ہے، اور جسے اہل سنت واہل بدعت کے درمیان حد فاصل بھی بتایا ہے۔

میں سب سے پہلے دلائل کے ذریعہ اس مسئلے کی کو بیان کروں گا، پھر اقوال صحابہ اور اجماع امت ذکر کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

۱- عن عبد الله رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وكره، ما لم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة».[1]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "ایک مسلمان کے لیے امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ یہ اطاعت پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں باتوں میں ہے بشرطیکہ اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر اسے گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ بات سنی جائے اور نہ اطاعت ہی کی جائے۔"

۲- عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «عليك السمع والطاعة في عسرك ويسرك، ومنشطك ومكرهك، وأثرة عليك».[2]

---

(۱) صحیح البخاری: (۷۱۴۴).
(۲) صحیح مسلم: (۱۸۳۶).

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر (امیر کا حکم) سننا اور ماننا واجب ہے، اپنی مشکل (کی کیفیت) میں بھی اور اپنی آسانی میں بھی، اپنی خوشی میں بھی اور اپنی ناخوشی میں بھی اور اس وقت بھی جب تک پر (کسی اور کو) ترجیح دی جارہی ہو۔''

۳- عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ – رضي الله عنه – قَالَ: سَأَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيدَ الْجُعْفِيُّ – رضي الله عنه – رَسُولَ اللهِ – صلى الله عليه وسلم – فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللهِ , أَرَأَيْتَ إِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَاءُ يَسْأَلُونَا حَقَّهُمْ , وَيَمْنَعُونَا حَقَّنَا , فَمَا تَأْمُرُنَا؟ , "فَأَعْرَضَ عَنْهُ رَسُولُ اللهِ – صلى الله عليه وسلم –" , ثُمَّ سَأَلَهُ , "فَأَعْرَضَ عَنْهُ"، ثُمَّ سَأَلَهُ الثَّالِثَةَ فَجَذَبَهُ الْأَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ – رضي الله عنه – فَقَالَ رَسُولُ اللهِ – صلى الله عليه وسلم: " اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا , فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا , وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ ".(۱)

سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ تعالی عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور کہا: اللہ کے نبی ﷺ! آپ کیسے دیکھتے ہیں کہ اگر ہم پر ایسے لوگ حکمران بنیں جو ہم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور ہمارے حق ہمیں نہ دیں تو اس صورت میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے اس سے اعراض فرمایا، اس نے دوبارہ سوال کیا، آپ نے پھر اعراض فرمایا، پھر جب اس نے دوسری یا تیسری بار سوال کیا تو اس کو اشعث بن قیس رضی اللہ تعالی عنہ نے کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سنو اور اطاعت کرو کیونکہ جو ذمہ داری ان کو دی گئی اس کا بار ان پر ہے اور جو ذمہ داری تمہیں دی گئی ہے، اس کا بوجھ تم پر ہے۔''

٤- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا مَاتَ نَبِيٌّ قَامَ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِي». قَالَ رَجُلٌ: فَمَا يَكُونُ بَعْدَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «تَكُونُ خُلَفَاءُ، وَتَكْثُرُ»، قَالَ: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: «أَوْفُوا بِبَيعَةِ الْأَوَّلِ فَالْأَوَّلِ، فَأَدُّوا إِلَيْهِمُ الَّذِي لَهُمْ، فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَنِ الَّذِي لَكُمْ».(۲)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کرم ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی حکومت حضرات انبیاءؑ چلاتے اور ان کے امور کا انتظام کرتے تھے۔ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو اس کا جانشین دوسرا نبی ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی تو نہیں ہو گا، ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ، آپ کے بعد پھر کون لوگ ہوں گے۔ البتہ خلفاء ہوں گے

(۱) صحیح مسلم: (۱۸۴۶).
(۲) السنۃ لابن ابی عاصم (۲/۵۱۲)، صحیح ابن حبان: (۱۴/۱۴۲).

اور وہ بھی بکثرت ہوں گے۔" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: پھر آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "جب کوئی خلیفہ ہو جائے۔ (اور تم نے اس سے بیعت کر لی ہو) تو اس سے کی ہوئی بیعت پوری کرو۔ پھر اس کے بعد جو پہلے ہو اس کی بیعت پوری کرو۔ انھیں ان کا حق دو۔ اور تمہارے حق کے تعلق سے اللہ رب العالمین ان سے سوال کرے گا۔

٥- عن ابن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «ستكون أثرة وأمور تنكرونها» قالوا: يا رسول الله فما تأمرنا؟ قال: «تؤدون الحق الذي عليكم، وتسألون الله الذي لكم».(١)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "عنقریب دوسروں کو تم پر ترجیح دی جائے گی اور ایسے امور ہوں گے جنھیں تم ناپسند کرو گے۔" صحابہ کرام رضوان اللہ عنھم اجمعین نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ایسے حالات میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "جو فرائض تمہارے ذمے ہیں تم انھیں پوری ذمہ داری سے ادا کرتے رہو اور جو تمہارا حق ہے وہ اللہ سے مانگو۔"

٦- عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَلْيَصْبِرْ فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنْ السُّلْطَانِ شِبْرًا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.(٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو صبر کرے کیونکہ اگر کوئی اپنے امیر کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر نکلا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔"

٧- وَعَنْ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ -رضي الله عنه - قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ- صلى الله عليه وسلم -: "أطيعوا أمراءكم ما كان، فإن أمروكم بما حدثتكم به فإنهم يؤجرون عليه، وتؤجرون بطاعتكم، وإن أمروكم بشيء مما لم آمركم به فهو عليهم، وأنتم منه برءا، ذلك بأنكم إذا لقيتم الله قلتم: ربنا لا ظلم، فيقول: لا ظلم، فتقولون: ربنا أرسلت إلينا رسلا فأطعناهم بإذنك، واستخلفت علينا خلفاء فأطعناهم بإذنك، وأمرت علينا أمراء فأطعناهم "، قال: " فيقول: صدقتم، هو عليهم، وأنتم منه برءا".(٣)

---

(١) صحیح البخاری: (٣٦٠٣).

(٢) صحیح البخاری: (٧٠٥٣).

(٣) السنن الکبری للبیہقی (٨/ ٢٧٤)، اسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے "ظلال الجنۃ" میں صحیح کہا ہے: (١٠٤٨).

ترجمہ: مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہر صورت اپنے حکام کی اطاعت کرو، اگر انہوں نے تمہیں ایسے کام کا حکم دیا جو میری لائی ہوئی شریعت میں نہیں ہے تو اس کا گناہ ان پر ہوگا اور تم اس سے بری ہو، اور اگر میری لائی ہوئی شریعت کے مطابق حکم دیا تو انہیں بھی اجر ملے گا اور تمہیں بھی۔ اور وہ یوں کہ جب تم اپنے رب سے ملوگے تو کہوگے: اے ہمارے رب! ہم پر کوئی گناہ نہیں؟ تو رب تعالی فرمائے گا: کوئی گناہ ہے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمارے پاس اپنے رسولوں کو بھیجا تو ہم نے ان اتباع کی اور ہمارے اوپر خلفا مقرر کئے تو ہم نے ان کی اطاعت کی اور امراء مقرر کئے تو ان کے بھی مطیع و فرمانبردار رہے، اللہ رب العالمین فرمائے گا: تم لوگوں نے سچ کہا ہے، گناہ ان (امراء) پر ہے، تم لوگ اس سے بری ہو۔

ایک اہم اعتقادی مسئلہ میں زاہد الکوثری کی تدلیس کا جواب

ابواحمد کلیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

اعتراض: "اگر اللہ چاہے تو مچھر کی پشت پر بیٹھ سکتا ہے تو پھر عرش عظیم پر کیوں نہیں بیٹھ سکتا" کیا یہ قول شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہے؟

جواب: اس کلام کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جانب نسبت کرنے کی ابتدا کوثری جہمی نے کی، پھر اس کے وارثین نے جیسے حسن سقاف وغیرہ نے اپنے شیخ کی تقلید میں مذکورہ کلام کی نسبت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جانب کی، اور انہی کے نقش قدم پر ان کے پیروکار بھی چل رہے ہیں۔

پہلی بات: دراصل یہ کلام امام دارمی رحمہ اللہ کا ہے، لیکن ترجمہ میں خیانت کی گئی ہے، امام دارمی رحمہ اللہ نے "بیٹھنے" کی بات نہیں کہی ہے بلکہ "استقرار" کی بات کی ہے، اور دونوں لفظ میں زمین وآسمان کا فرق ہے جیسا کہ عربی زبان کا شد بد رکھنے والے بہتر جانتے ہیں۔

دوسری بات: ترجمہ کرنے والے نے دوسری خیانت یہ کی ہے کہ بعض کلام کو حذف کر دیا ہے جس سے معنی میں بظاہر تھوڑا سا اشکال پیدا ہو رہا، اگر وہ کلام ذکر کر دیا جائے تو یہ شبہ خود بخود ہی دفع ہو جائے گا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے امام دارمی رحمہ اللہ کا جو کلام نقل کیا ہے وہ یوں ہے: "ولو قد شاء لاستقر على ظهر بعوضة فاستقلت به بقدرته ولطف ربوبيته فكيف على عرش عظيم أكبر من السموات والأرض"[1]۔

ترجمہ: اگر اللہ رب العالمین چاہتا تو ایک مچھر کی پشت پر بھی مستقر ہو جاتا، اور وہ مچھر؛ قدرت الٰہی اور لطف ربانی کے سبب، ثابت اور قائم ودائم رہتا، تو پھر اس عرش پہ رب تعالی کا استواء کیونکر ممکن نہیں جس کی وسعت آسمان وزمین سے بھی بڑھی ہوئی ہے؟

(۱) نقض الإمام أبي سعيد عثمان بن سعيد على المريسي الجهمي العنيد فيما افترى على الله عز وجل من التوحيد: (۱/۴۵۸)۔

قارئین کرام: غور فرمائیں کہ امام دارمی رحمہ اللہ نے مچھر کی پشت پر استقرار کو رب العالمین کی "مشیت" و "قدرت" پر معلق کیا ہے، اور یقیناً ایسا کرنا اللہ رب العزت کی مشیت و قدرت سے باہر نہیں، کوئی زندیق ہی اسے اللہ رب العالمین کی مشیت سے باہر سمجھ سکتا ہے۔

تیسری بات: امام دارمی رحمہ اللہ نے یہ بات بشر مریسی جہمی سے مناظرہ کے درمیان کہی تھی، اور اسی کلام کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، معلوم یہ ہوا کہ یہ کلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نہیں ہے، نیز دوران مناظرہ کہی جانے والی بات قاعدہ کلیہ نہیں ہوتی کہ اسے قاعدہ مان کر اس سے استدلال کیا جائے۔

چوتھی بات: نقل کرنے والے نے امام دارمی رحمہ کا پورا کلام نقل نہیں کیا ہے، اگر پورا کلام نقل کیا جائے تو امام دارمی کی مراد بالکل واضح ہو جاتی کہ وہ بشر مریسی پر رد کرتے ہوئے یہ کلام کر رہے ہیں، اور اللہ رب العالمین کے "علو" و "استواء" کو ثابت کر رہے ہیں۔

پانچویں بات: امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنے مذکورہ بالا کلام سے مچھر کی پشت پر اللہ کے استقرار کو ثابت کرنا نہیں چاہا ہے بلکہ وہ اس سے اللہ رب العالمین کی مشیئت اور قدرت کاملہ ثابت کرتے ہوئے اللہ رب العزت کیلئے "علو" اور "استوا علی العرش" کو ثابت کر رہے ہیں، چنانچہ اگر آپ قارئین امام دارمی رحمہ اللہ کے کلام میں غور کریں گے تو بات باآسانی سمجھ جائیں گے کہ:

۱۔ امام دارمی رحمہ اللہ نے حرف "لو" کا استعمال کیا ہے، اور نحویوں کے نزدیک حرف "لو" امتناع کیلئے آتا ہے، یعنی شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں جواب بھی معدوم ہوگا ہے، یعنی اگر اللہ رب العالمین چاہے تو مچھر کی پشت پر مستقر ہو سکتا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا اس لئے اس کا وقوع نہیں ہوا۔

۲۔ نیز لفظ "اگر" اور "مشیت" کے استعمال سے بات بالکل واضح ہے کہ امام دارمی رحمہ اللہ نے اس امر کے وقوع کو ثابت کرنا مراد نہیں لیا ہے۔

۳۔ چونکہ بشر مریسی جہمی معتزلی اللہ رب العالمین کے عرش پر مستوی ہونے کا اور علو مطلق کا انکار کرتا تھا اس لئے امام دارمی رحمہ اللہ نے اس کے اس انکار کے جواب میں الزاماً کہا کہ اللہ رب العزت قادر مطلق ہے، اس کی صفت "لطیف" ہے، اگر وہ چاہے تو مچھر کی پشت پر مستقر ہو سکتا ہے تو پھر "عرش" تو زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات سے بڑی مخلوق ہے وہ اس پر

مستوی کیوں نہیں ہو سکتا؟ پانچویں بات: اللہ رب العالمین نے فرمایا: «لَوْ كانَ فِيهِما آلِهَةٌ إِلّا اللَّهُ لَفَسَدَتا فَسُبْحانَ اللَّهِ رَبِّ العَرْشِ عَمّا يَصِفُونَ»[1]۔

ترجمہ: اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو زمین وآسمان میں بگاڑ و فساد پیدا ہو جاتا، پس عرش والا رب پاک ہے اللہ ان تمام عیوب و نقائص سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

کیا شیخ الاسلام ابن تیمیہ یا امام دارمی رحمہما اللہ پر اللہ رب العالمین کی توہین کا الزام لگانے یہ کہیں گے کہ (العیاذ باللہ) اللہ رب العالمین دوسرے معبود کو درست اور صحیح قرار دے رہا ہے؟ ہر گز نہیں، کیوں کہ اللہ رب العالمین نے کہا کہ "اگر ایسا ہوتا" اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایسا ہوا ہی نہیں، معلوم یہ ہوا کہ لفظ "لو" کے استعمال سے کسی چیز کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ:

- مذکورہ بالا کلام شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نہیں ہے۔
- مذکورہ بالا کلام میں "استقرار" کا ترجمہ "بیٹھنے" سے کرنا مترجم کی خیانت ہے۔
- مترجم نے امام دارمی کے کلام میں کتر بیونت کیا ہے، چنانچہ جس جملے سے احتمال زائل ہو رہا تھا اسے حذف کر دیا۔
- یہ کلام امام دارمی رحمہ اللہ کا ہے، اور معنی کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے کیونکہ اس میں ذات باری تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کاملہ کو بتایا گیا ہے، نہ کہ مچھر کی پشت پر "استقرار" کو صفت الٰہی بنا کر پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ مترجمین نے جھوٹ و خیانت کا سہارا لے کر اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
- لفظ "لو" کے استعمال سے حقیقت امر کے وقوع کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا، جیسا مندرجہ بالا سطور میں آیت کریمہ گزری۔
- اللہ رب العالمین کا عرش پر مستوی ہونا قرآن و حدیث کے صریح نصوص سے ثابت ہے، لیکن معتزلہ، جہمیہ اور دیگر فرق باطلہ اس صفت کا انکار کرتے ہیں، اور اپنے انکار کو درست ثابت کرنے کیلئے اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگاتے ہیں۔

---

[1] الأنبياء: الآية: ۲۲.

الولاء والبراء کا صحیح معنی ومفہوم (قسط اول)

عبداللہ عبدالرشید مدنی
فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

شریعت اسلامیہ ہر طریقے سے کامل و مکمل ہے جسکی بنیاد جلب مصلحت اور دفع مفسدت پر رکھی گئی ہے۔اس کی گوناگوں خصوصیات میں سے ایک عظیم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رب العالمین نے ہم مسلمانوں کو دوسرے ادیان وفرق کے ماننے والوں کے ساتھ دینی ومعاشرتی ،ہر دو اعتبار سے تعلقات قائم کرنے کا طریقہ سکھایا ہے تاکہ ہم کسی بھی طرح کے فتنہ و فساد میں مبتلا نہ ہوں۔اسی کو عقیدہ الولاء والبراء کہتے ہیں جسے ہماری شریعت میں بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔

معنی ومفہوم: کتب معاجم و قوامیس میں ولاء وبراء کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں جنہیں استاد محترم شیخ سلیمان الرحیلی حفظہ اللہ نے مختصر الفاظ میں جمع کردیا ہے؛ **فرماتے ہیں:** "الولاء" عربی زبان میں کسی چیز سے قریب ہونے اور نصرت و محبت پر دلالت کرتا ہے، اور یہ "العداوۃ" (دشمنی) کی ضد ہے۔ لہٰذا "ولی" اس شخص کو کہتے ہیں جو قریب ہو۔ اور شریعت کی اصطلاح میں ظاہری اور باطنی اعتبار سے محبوب لوگوں کے ساتھ ہونا 'وَلاء' کہلاتا ہے۔اسی طرح نصرت، محبت اور تعظیم بھی اس کے معنی میں داخل ہیں۔ اور ان تمام کی بنیاد محبت ہے۔

مزید فرماتے ہیں: علماء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ولاء شرعاً مطلوب ہے اور یہ اللہ سے ، اسکے رسول ﷺ سے، دین اسلام سے، اور تا قیامت اسکا اتباع کرنے والوں سے محبت کو کہتے ہیں۔

اسکے بعد شیخ حفظہ اللہ 'البَراء' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "البراء" لغت میں دوری، دشمنی، ناپسندیدہ چیز سے علیحیدگی اور قطع تعلّق کو کہتے ہیں، اور شریعت میں اس کا معنی دشمنی، بغض اور براءت حاصل کرنا ہے۔

مزید فرماتے ہیں: علماء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ براء شرعاً مطلوب ہے اور یہ ان تمام قسم کے لوگوں سے بغض وعداوت کو کہتے ہیں جن کی اللہ کے علاوہ عبادت کی جاتی ہے اور وہ اپنی عبادت سے راضی ہیں۔اسی طرح کفر کی تمام اقسام

سے، تمام کفار سے اور مسلمانوں میں سے عاصی (گنہگار) قسم کے لوگوں سے انکی معصیت (گناہ) کے بقدر بغض و عداوت رکھنا بھی براء میں داخل ہے۔[۱]

اہمیت:

ولاء اور براء کا عقیدہ ایمان کا ایک عظیم حصہ ہے۔اللہ رب االعالمین کا ارشاد ہے: إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ، وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ۔[۲]

ترجمہ: (مسلمانو) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکاۃ ادا کرتے ہیں اور وہ رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں،اور جو شخص اللہ تعالی سے اور اسکے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے وہ یقین جانے کہ اللہ تعالی کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

نیز فرمایا: تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ، وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ۔[۳]

ترجمہ: ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں۔جو کچھ انہوں نے اپنے لئے آگے بھیج رکھا ہے وہ بہت برا ہے کہ اللہ تعالی ان سے ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔اگر انہیں اللہ پر اور نبی پر اور جو نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان ہوتا وہ ان سے (کفار سے) دوستیاں نہ کرتے، لیکن ان میں کے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

بلکہ اللہ کے نبی ﷺ نے اسے ایمان کا سب سے مضبوط کڑا قرار دیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنھما سے روایت ہے: اللہ کے رسول ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایمان کا سب سے مضبوط کڑا کیا ہے؟انہوں نے کہا کہ اللہ اور

---

(۱) شیخ حفظہ اللہ کے جامعہ اسلامیہ میں ہوئے ایک دورہ علمیہ سے ماخوذ۔

(۲) سورۃ المائدۃ: (۵۵،۵۶)

(۳) سورۃ المائدۃ: (۸۰،۸۱)

اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کیلئے دوستی کرنا،اللہ ہی کیلئے دشمنی کرنا اور اللہ کیلئے محبت کرنا اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھنا۔(۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شہادتِ لاالہ الااللہ کی پختگی کا یہ تقاضا ہے کہ صرف اللہ ہی کیلئے محبت کی جائے،اللہ ہی کیلئے بغض رکھا جائے اور اللہ ہی کیلئے دوستی کی جائے اور اللہ ہی کیلئے دشمنی کی جائے۔اور اللہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اس سے محبت کی جائے اور وہ جس چیز سے بغض رکھتا ہے اس سے بغض رکھا جائے۔(۲)

لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالی نے ہم پر مومنین کے ساتھ محبت و موالات کو اور کفار و مشرکین کے ساتھ بغض وعداوت کو واجب قرار دیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یقینا مومنین اللہ کے ولی ہیں اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں اور کفار اللہ اور مومنین کے دشمن ہیں۔اسلئے اللہ نے مومنین کے درمیان موالات کو واجب قرار دیا ہے اور یہ واضح کردیا ہے کہ یہ ایمان کے لوازمات میں سے ہے۔اور کفار سے دوستی اور قرابت سے منع کیا ہے اور یہ واضح کردیا ہے کہ یہ مومنین کیلئے جائز نہیں ہے۔(۳)

ولاء وبراء کے مسئلے میں تساہلی برتنے کے نقصانات:

شیخ سلیمان الرحیلی حفظہ اللہ فرماتے ہیں: غلو یا تفریط کی بنیاد پر ولاء اور براء کو صحیح شرعی طریقے پر انجام نہ دینے کے نتیجے میں زمین پر فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔لہٰذا جن لوگوں نے ولاء وبراء کے باب میں غلو کیا وہ دین میں فتنہ کے شکار ہوگئے اور (اس قدر آگے نکل گئے کہ) فتنہ تکفیر میں پھنس گئے۔نیز ولاء وبراء کے نام پر انہوں نے لوگوں کو اللہ کے صحیح دین سے روکا، فسق وفجور اور تخریب وتدمیر مچایا اور مساجد کی حرمت کو پامال کرکے نمازیوں کا قتل عام کیا۔اور جن لوگوں نے ولاء و براء کے باب میں تساہل کیا وہ بھی دین میں فتنہ کے شکار ہوگئے،اغیار کے ساتھ جاملے اور اپنے عقیدہ سے بہت دور نکل گئے۔

مزید فرماتے ہیں: "اور بہت سے لوگوں نے ولاء وبراء کو اپنی خواہشات کا تختہ مشق بناڈالا۔چنانچہ اگر اس باب میں انہیں انکا فائدہ نظر آیا تو اس پر عمل پیرا ہوگئے اور اگر انکی خواہشات کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آئی تو اسے سرے سے خارج ہی کرڈالا۔

---

(۱) شرح السنۃ للبغوی: (۳۴۶۸)،علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: ۹۹۸) میں حسن کہا ہے۔

(۲) الاحتجاج بالقدر: (۶۲)

(۳) مجموع الفتاوی: (۱۹۰/۲۸)

جیسا کہ اخوان المسلمین نے کیا، جنہوں نے ولاء کو اپنی جماعت کے افکار سے ساتھ مشروط کر دیا۔ لہٰذا جو انکی جماعت کے ساتھ ہوا وہ انکا ولی اور محبوب ہوا بلکہ انکا پسندیدہ عالم قرار پایا اور جس نے انکی جماعت کے نظریے کی مخالفت کی تو وہ اہل جاہلیت اور دشمنوں میں سے ہو گیا"۔ (۱)

اس اعتبار سے اس باب میں لوگوں کی تین قسمیں ہوئیں:

1۔ غلو کرنے والے۔ جیسے تکفیری مزاج کے لوگ جو ہر چھوٹی بات پر لوگوں کو کافر قرار دیدیتے ہیں۔

2۔ تساہل کرنے والے۔ جیسے وحدت ادیان کا نعرہ لگانے والے اور کفار و مشرکین سے دوستی کو بھی اسلام کی تعلیمات قرار دینے والے لوگ۔

3۔ اعتدال کا راستہ اختیار کرنے والے۔ اس صفت کے حاملین صرف اہل السنہ والجماعہ ہیں۔

ولاء وبراء کی اقسام اور ان کا حکم:

ولاء کی دو قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو انجام دینا ولاء ہے اور ترک کر دینا براء ہے:

پہلی قسم: دین کی بنیاد پر موالات اور محبت کرنا۔ یہ مسلمانوں کے حق میں واجب ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کا اسکی دینداری کی بنیاد پر ساتھ دیا جائے گا اور ظالم و مظلوم، ہر دو صورت میں شرعی طریقے پر اسکی مدد کی جائے گی۔ یہی درحقیقت دین کی بنیاد پر موالات قائم کرنا ہے۔ اسکے کئی درجات ہیں۔ اسکا صحیح مفہوم بالتفصیل آرہا ہے ان شاء اللہ۔

اور کفار کے حق میں یہ حرام، بلکہ کفر ہے۔ یعنی کوئی مسلمان کسی کافر سے اسکے کفر کی وجہ سے محبت کرے اور دوستیاں اور تعلقات قائم کرے تو یہ کفر ہے۔ چنانچہ کفار سے اسکے کفر کی وجہ سے بغض و عداوت رکھی جائے گی۔ یہی براء ہے۔

دوسری قسم: دین کے علاوہ کسی اور بنیاد پر محبت اور موالات قائم کرنا۔ چنانچہ یہ مسلمانوں کے حق میں مباح اور جائز ہے۔ اور کفار کے حق میں یہ حرام ہے لیکن کفر کے درجہ تک نہیں پہنچتا۔ جیسے کسی کافر سے اسکے گویے ہونے کی وجہ سے محبت کرنا یا

(۱) شیخ حفظہ اللہ کے جامعہ اسلامیہ میں ہوئے ایک دورہ علمیہ سے ماخوذ۔

موالات قائم کرنا۔ چنانچہ کفار سے بہر صورت انکے کفر کی وجہ سے بغض و عداوت ہی رکھی جائے گی اور کسی بھی وجہ سے ان سے قلبی لگاؤ کی اجازت نہیں ہے۔

البتہ اسکے کئی درجات ہیں جسکی وجہ سے بعض صورتیں اس سے نکل جاتی ہیں، جیسے باپ اور بیٹے کی آپسی فطری محبت وغیرہ۔ آگے اس کا تفصیلی بیان آرہا ہے ان شاء اللہ۔

قرآن مجید کی لغوی تفسیر: مفہوم وضوابط (قسط اول)

حافظ فیضان عالم
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، جس کی تفسیر وتوضیح کے لئے علماے سلف نے متعدد نواحی سے غور وفکر فرمایا ہے۔اس عمل کی انجام دہی کے لئے انہوں نے جن امور کو پیش نظر رکھا ہے، اسے ہم مصادر تفسیر سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کے ذریعہ ایک مفسر قرآن کے درست معانی ومطالب تک رسائی پاتا ہے۔ قرآن کی تفسیر میں عربی لغت بنیادی مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ تفسیر کا عمل کلام الٰہی کے مدلول کی آگہی سے عبارت ہے، جو کہ متعلقہ زبان کے علم کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے اہل علم نے قرآن مجید کی تفسیر کی خاطر عربی زبان کی اعلی جانکاری ہونے کو ضروری قرار دیا ہے، بلکہ اس بابت سلف نے عربی زبان کی عدم معرفت کو بہت ہی سنگین جرم تسلیم کیا ہے، کیونکہ یہ نقص قرآن کی غلط تفسیر پر منتج ہوگا۔ مشہور مفسر، تابعی، امام مجاہد بن جبر (۱۰۴ھ) فرماتے ہیں: «لا يحل لأحد يؤمن بالله واليوم الآخر أن يتكلم في كتاب الله إذا لم يكن عالما بلغات العرب»۔[1]

جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ قرآن کے بارے میں گفتگو کرے اور وہ عربی زبان سے نابلد ہو۔

قرآن مجید کی لغوی تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی کی توضیح عربی زبان کے مفردات وتراکیب کی مدد سے کی جائے۔ مفسرین نے اول روز سے اس جانب اہتمام فرمایا ہے، صحابہ کرام اور تابعین کے ہاں بھی ہمیں یہ طرز تفسیر دیکھنے ملتی ہے، بطور استشہاد صحابہ کرام کا آیت "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ"[2]، میں وارد لفظ "ظلم" کی بابت استفسار اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے ہاں قرآنی مفردات وتراکیب کی تفہیم اس کے لغوی دلالت سے بھی طے کی جاتی تھی، اگر اس درمیان کوئی چوک ہو جاتی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصویب فرمادیتے۔ لیکن آپ صلی اللہ

(۱) البرہان: ۱/۲۹۲۔
(۲) سورۃ: الأنعام، آیت نمبر: ۸۲۔

علیہ وسلم نے کبھی ان کے اس عمل پر نکیر نہیں فرمائی۔ صاحب مقدمۃ المبانی[۱] نے امام واحدی کے حوالے سے صحابہ کرام کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ لغت کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرنا جائز ہے۔[۲]

اس عمل کے جواز کے ساتھ قرآن پر لغوی ناحیے سے غور وخوض کرنے کا ایک بڑا فائدہ امت کو یہ حاصل ہوا کہ جن اہل باطل نے کلام ربانی کی باطنی یا علامتی تفسیر کرنے کی جرات کی، مفسرین نے لغت کے ذریعہ ان تفاسیر کے بطلان کو ظاہر کیا۔ لیکن اس تناظر میں بعض گروہ ایسے بھی نمودار ہوئے، نے اپنے معتقدات کو دینی پیرایہ عطا کرنے کے لیے، لغت کا سہارا لیا، اور مطلوبہ معانی کے استخراج کے لیے آیات کی لغوی تاویل کی۔ تفسیر کے باب میں اس انحراف کے ظہور میں چند اسباب کارفرما تھے:

۱۔ قرآن کی تفسیر میں لغت کو دیگر مصادر کے بالمقابل زیادہ اہم سمجھنا۔

اہل علم نے مصادر تفسیر اور ان کے مدارج کا تعین صحابہ اور تابعین کے طرز تعامل سے طے فرمایا ہے، جسے اہل علم بالترتیب یوں رقم فرماتے ہیں:

۱- قرآن کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرنا۔

۲- سنت نبوی کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرنا۔

۳- اقوال سلف (صحابہ، تابعین اور تبع تابعین) کے ذریعہ تفسیر کرنا۔

۴- کلام عرب کے ذریعہ تفسیر کرنا۔

---

(۱) مقدمتان فی علوم القرآن مستشرق آرتھر جفری کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے، پہلا مقدمہ اہل علم کے درمیان محض مقدمہ کتاب المبانی کے نام سے معروف ہے، اور دوسرا مقدمہ تفسیر ابن عطیہ کا ہے، مقدمہ کتاب المبانی کے مولف کی بابت مخطوطے کے پہلا ورق مفقود ہونے کی وجہ سے محقق نے عدم جانکاری کا اظہار کیا ہے۔ نیز بالعموم دیگر محققین کی بھی اس بابت کوئی رائے نہیں ملتی۔ دکتور غانم قدوری الحمد نے مضبوط قرائن کی روشنی میں اس مقدمے کو ابن بسطام (۴۲۵ھ) کی طرف منسوب کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دکتور غانم کا مضمون دیکھیں:
مؤلف التفسیر المسمی: کتاب المبانی لنظم المعانی۔ مطبوعہ در مجلّہ رسالہ، شمارہ نمبر ۱۶۴-۱۶۵، سنہ ۱۴۰۴ھ۔
(۲) مقدمتان فی علوم القرآن ۲۰۱۔

قرآن کی تفسیر میں اس ترتیب کا التزام نہایت ضروری ہے، محض لغت کا سہارا لے کر دیگر مصادر سے پہلو تہی اختیار کرنا خطا کا موجب ہے، کیونکہ بیشتر اوقات قرآن اپنے لغوی دلالت میں صریح ہونے کے باوجود سیاق، نبوی تفسیر، اجماع اور اقوال سلف کے باعث آیت کا معنی مختلف قرار پاتا ہے۔ اس لئے اہل علم محض لغت کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کو مذموم گردانتے ہیں۔

امام قرطبی (۶۷۰ھ) کہتے ہیں: "فمن لم يحكم بظاهر التفسير وبادر إلى استنباط المعاني بمجرد فهم العربية كثر غلطه ودخل في زمرة من يفسر بالرأي"۔

ترجمہ: جس نے تفسیر پر توجہ صرف کرنے کے بجائے محض عربی دانی کی بنیاد پر معانی کے استنباط میں پیشی کی، اس سے کافی غلطی کا صدور ہوا، اور ان زمروں میں شمار کیا گیا جو رائے کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔[۱]

تفسیر میں غلطی واقع ہونے کے اسباب کے ذکر میں امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) فرماتے ہیں: "قوم فسروا القرآن بمجرّد ما يسوغ أن يريده بكلامه من كان من الناطقين بلغة العرب، من غير نظر إلى المتكلم بالقرآن، والمنزل عليه، والمخاطب به."[۲]

بعض قوم نے قرآن کی تفسیر محض لغت عرب سے کی ہے، اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ متکلم قرآن (اللہ سبحانہ وتعالی) کی مراد کیا ہے، اور جس پر قرآن نازل ہوا ہے اس نے کیا مطلب بیان فرمایا ہے، اور اس کے اولین مخاطب نے اس سے کیا سمجھا ہے۔

بطور مثال اس آیت کی تفسیر کو دیکھنا اہم ہوگا۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: "فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ"۔[۳]

سلف نے "كلمة" کی تفسیر حضرت عیسی علیہ السلام سے کی ہے، جیسا کہ صحابی رسول ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، سدی، ربیع اور ضحاک سے منقول ہے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱/۳۴۔
(۲) مقدمہ اصول تفسیر: ۸۱۔
(۳) آل عمران: ۳۹۔

ابو عبیدۃ معمر بن المثنی (۲۰۹ھ) فرماتے ہیں: "کلمتہ من اللہ سے مراد اللہ کی کتاب مراد ہے، عرب کہتے ہیں: "أنشدني كلمة كذا وكذا، أي: قصيدة فلان وإن طالت"۔ (1)

امام طبری رحمہ اللہ (۳۱۰ھ) فرماتے ہیں: "کہ بعض اہل علم کا اہل بصرہ کی لغت کے وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ: "مصدقا بكلمة من الله" کا معنی اللہ کی کتاب کی تصدیق ہے۔ اور وہ اسے عرب کے اس قول سے ماخوذ مانتے ہیں: "أنشدني فلان كلمة كذا، يراد به قصيدة كذا" ان کا یہ قول بتاتا ہے کہ وہ طریقہ تفسیر سے نابلد ہیں، اور اپنی رائے کی ذریعہ قرآن کی معانی بیان کرنے کی جرات کرتے ہیں"۔ (۲)

۲- علماے سلف سے وراد لغوی اقوال سے بے اعتنائی برتنا۔

لغوی تفسیر کے حوالے سے یہ رویہ عام ہے کہ اہل لغت کے قول کے آگے کسی دوسرے قول کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے ان کے نزدیک لغوی مفہوم کے تعین میں واحد اہل لغت کی ہی رائے مستند ہوتی ہے، جبکہ یہ امر اس قدر سادہ نہیں، مسئلے میں تفصیل ہے، جسے نظر انداز کرنا غلط تفسیر کو لازم کرتا ہے، اس امر کو سمجھنے سے پہلے ہمیں لغوی تفسیر کے تاریخی مراحل کو نظر میں رکھنا اہم ہوگا۔ لغوی تفسیر کے تین مراحل ہیں، لغوی تفسیر کا ایک مرحلہ صحابہ اور تابعین کے دور سے متعلق ہے، جہاں لغت کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرنے کے بیشتر شواہد موجود ہیں، اور یہ عمل اہل لغت کی تدوین سے پہلے سے جاری تھا، صحابہ کرام اور تابعین کی لغت فہمی کا معیار نسبتاً فروتر نہیں تھا، بلکہ اہل لغت کے بالمقابل آپ تمام عربی النسل تھے، اور تابعین میں بھی بیشتر کا تعلق عربوں سے تھا، بقیہ جن کی زبان عربی نہیں تھی، انہوں نے عربی براہ راست صحابہ کرام سے سیکھا تھا، اور آپ تمام کا تعلق اس دور سے تھا جہاں لغوی استشہاد واستدلال کے لئے اہل زبان کی رائے مستند سمجھی جاتی تھی، جسے ہم اصطلاح میں عصر الاحتجاج سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ وہ دور ہے جب لغت کی تدوین نہیں ہوئی تھی، جہاں لغوی تفسیر کے لئے سلف کے اقوال ہی سے مدد لی جاتی تھی، کیونکہ امر واقعی یہ ہے کہ کسی معنی کے تعین کے لئے جس سیاق، اور احوال کی معرفت ضروری ہے، ان تمام امور سے سلف بخوبی واقف تھے، لہٰذا لغوی تفسیر کی بابت اہل لغت کے بالمقابل سلف کی تفسیر کو مقدم سمجھا جانا چاہیئے، کیونکہ انہیں اس باب میں اولیت حاصل ہے، نیز لغوی تدوین کا عمل خلیل بن احمد الفراہیدی (۱۷۵ھ) کی کتاب کتاب العین سے شروع ہوا، جس کے بعد غریب القرآن، معانی القرآن اور

---

(۱) مجاز القرآن: ۹۱/۱۔

(۲) تفسیر الطبری: ۳۷۴/۶۔

دیگر معاجم معرض وجود میں آئے، اس کے بعد اہل لغت کا ایک خاص حلقہ وجود میں آیا، جنہوں نے ان تمام اہل علم کی آرا کو مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس کے بعد تمام لسانی امور میں بشمول قرآن کے، مفردات وتراکیب کی توضیح کے لیے بھی ان سے رجوع کیا جانے لگا، اور ان کے بالمقابل کسی پیشتر لغت داں کی رائے اس توجہ کی مستحق نہیں ٹھہری یا اسے وہ اعتبار حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ حالانکہ زبان کی تفہیم اور متن کی تشریح میں مخاطب کی رائے کو اولین درجہ حاصل ہوتا ہے، یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے، کہ یہاں اس شبہے کا کوئی گزر نہیں کہ اس موقف کے تناظر میں اہل لغت کے استناد کو غیر معتبر باور کیا جارہا ہے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ کلام الٰہی کے جو اولین مخاطب ہیں، جنہیں کلام کے سیاق، قرائن اور شان نزول سے مکمل آگہی حاصل ہے، جن سے ایک معتدبہ تعداد مستفید ہوئی ہے، جن کی آرا کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ مندرج ہیں، اس کے بالمقابل متعلقہ امر میں علی الاطلاق کسی متاخر کی رائے کیسے مستند قرار پاسکتی ہے۔ لہٰذا انہی احوال کے پیش نظر اہل علم لکھتے ہیں کہ متعلقہ مسئلے میں بوقت اختلاف بطور استشہاد اہل لغت کی آرا سے مستفید ہوا جاسکتا ہے، لیکن اگر ان کے کسی قول سے قرآن کا کوئی ایسا جدید معنی وجود میں آتا ہو، جس سے مفسرین سلف ناآشنا تھے، تو ایسی صورت میں وہ قول باطل کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ اس ناحیے سے جب اہل لغت اور سلف کے اقوال کا موازنہ قائم کیا جاتا ہے، تو ان کے مابین اختلاف اور اتفاق کی چار صورتیں نکلتی ہیں:

۱- اہل لغت اور صحابہ اور تابعین کے اقوال باہم متفق ہوں۔ (بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے)۔

۲- اہل لغت کی تفسیر سلف کی تفسیر سے معارض ہو۔ یہ بہر صورت غیر مقبول ہے۔ (یہ صورت نادر الوقوع ہے)
۔

۳- اہل لغت کی تفسیر اختلافِ تنوع کے قبیل سے ہو، اگر آیت میں اس تنوع کا احتمال موجود ہو، تو اہل علم کے نزدیک وہ تفسیر مقبول ہے۔

۴- اہل لغت سے کوئی ایسی تفسیر منقول ہو، جس کی بابت سلف کا کوئی قول وارد نہ ہو، تو ایسی صورت میں اہل لغت کی رائے متخصص ہونے کی رو سے مقبول قرار پاتی ہے۔

اہل بدعت سے علم حاصل کرنے اور ان کی تقریر وغیرہ سننے کے تعلق سے سلف صالحین کا منہج (قسط اول)

مامون رشید بن ہارون رشید سلفی
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

بلا شبہ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شاگردوں پر استاد کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے، اور شاگرد عموماً انہیں راستوں کی پیروی کرتا ہے اور انہیں چیزوں کو حق اور سچ سمجھتا ہے، جن پر اس کے اساتذہ چلتے ہیں، اگر اساتذہ کسی مخصوص زاویہ فکر کے حامل ہیں تو شاگردان بھی اسی فکر کو درست جانتے ہیں، اور اسی کی نشر واشاعت اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، اور بسا اوقات اسی کو دوستی اور دشمنی کا محور ومعیار بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اگر اساتذہ منحرف اور بدعتی ہوتے ہیں تو شاگردان بھی انحرافات وبدعات کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں، اور اگر اساتذہ موحد، متبع سنت اور صحیح المنہج مستقیم الفکر اور سلفی العقیدہ ہوتے ہیں تو طلبہ بھی راہ راست کے جیالے، حق وصداقت کے شیدائی، کتاب وسنت کے فدائی اور منہج سلف صالحین کے علمبردار بن جاتے ہیں، کسی دانا شخص نے کیا ہی خوب کہا ہے: **"اگر آپ لومڑی سے دین سیکھیں گے تو آہستہ آہستہ یہ ماننے لگیں گے کہ مرغیاں چرانا بھی ایک نیکی ہے"**۔

مزید برآں یہ چیز تاریخی حقائق اور مشاہدات و تجربات سے ثابت شدہ فطری قانون کا بھی حصہ ہے، چنانچہ حافظِ کبیر، محدثِ شہیر اور امامِ ذی شان عبد الرزاق بن ہمام صنعانی رحمہ اللہ جو جلیل القدر محدث ومفسر اور "المصنف" اور "التفسیر" جیسی گراں مایہ کتابوں کے مصنف تھے، لیکن جب آپ نے جعفر بن سلیمان الضبعی الشیعی کی صحبت اختیار کی اور ان سے علم حاصل کیا تو آپ کے اندر بھی کسی قدر تشیع داخل ہو گیا اور آپ حضرت علی کو عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینے لگے۔۔۔امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ایک روز عبد الرزاق کی زبانی ایک ایسی بات سنی جس سے مجھے ان کے عقیدے کے بارے میں جو باتیں ذکر کی جاتی ہیں ان کی دلیل فراہم ہو گئی، تو میں نے ان سے کہا کہ: آپ کے اساتذہ جن سے آپ نے علم حاصل کیا ہے وہ تمام کے تمام ثقہ اور اہل سنت تھے جیسے معمر، مالک بن انس، ابن جریج، سفیان ثوری اور

اوزاعی، پھر آپ نے یہ مذہب اور عقیدہ کس سے اخذ کیا ہے؟ فرمایا کہ: ہمارے یہاں جعفر بن سلیمان الضبعی تشریف لائے، تو ہم نے انہیں ایک بلند کردار اور خوش اخلاق شخص پایا، چنانچہ ہم نے ان سے یہ (تشیع کا) عقیدہ اخذ کر لیا۔[۱]

محمد بن ایوب بن الضُّرَیْسِ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: میں نے محمد بن ابی بکر المُقَدَّمی سے جعفر بن سلیمان کی حدیث کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ کیا عبد الرزاق نے ان سے روایت کی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ: میں عبد الرزاق سے ہاتھ دھو بیٹھا، جعفر نے ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں بگاڑا یعنی تشیع کے تعلق سے۔ (امام ذہبی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ عبد الرزاق کو جعفر بن سلیمان کے علاوہ کسی نے نہیں بگاڑا۔ یعنی ان کے عقیدے کو۔[۲]

واضح رہے کہ یہاں تشیع سے موجودہ تشیع یا رافضیت مراد نہیں ہے، بلکہ متقدمین علماء کے نزدیک جو شخص حضرت علی کو عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتا اسے شیعی سمجھا جاتا تھا اور جو حضرت علی کو ابو بکر و عمر سے افضل سمجھتا اسے رافضی تصور کیا جاتا تھا۔

عمرو بن عبید بصری معتزلی بڑا عابد و زاہد، اور متقی و پرہیز گار انسان تھا، حسن بصری، ابو العالیہ اور ابو قلابہ جیسے تابعین اور کبار علمائے امت سے کسب فیض کیا تھا، اس کی عبادت، زہد اور تقویٰ و طہارت کو دیکھ کر حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی تعریف کی تھی، اس کی علمی قدر و منزلت کا اعتراف کرتے ہوئے حماد بن سلمہ، حماد بن زید، سفیان بن عیینۃ اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے جلیل القدر محدثین نے شروع شروع میں اس سے حدیثیں بھی روایت کی تھیں، لیکن جب اس نے "مؤسس فرقہ معتزلہ واصل بن عطاء" کی صحبت اختیار کی اور اس سے علم حاصل کرنا شروع کیا تو راہ راست سے یکسر بھٹک گیا، اور معتزلہ کا دوسرا سب سے بڑا امام بن کر نمودار ہوا۔۔۔ نتیجتًا علماء نے اسے متروک ومنبوذ اور مطرود وملعون قرار دیا۔

حافظ اسماعیل بن علیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سب سے پہلے جس شخص نے اعتزال کے تعلق سے باتیں کی وہ واصل بن عطاء الغزال ہے، پھر اس میں عمرو بن عبید اس کا ہم رکاب اور ساتھی بن گیا، حتیٰ کہ اسے واصل اس قدر پسند آ گیا کہ اس

---

(۱) (تاریخ دمشق لابن عساکر ۱۸۷/۳۶، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال للمزی ۵۹/۱۸، تاریخ الاسلام للذہبی ط التوفیقیۃ ۱۴۸/۱۵، الوافی بالوفیات ۲۴۵/۱۸)۔

(۲) (سیر اعلام النبلاء ط الرسالۃ ۵۷۰/۹)۔

نے اس سے اپنی بہن کی شادی کرادی، اور اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہا کہ: میں نے تمہاری شادی ایک ایسے شخص سے کرائی ہے جو صرف خلیفہ بننے کے لائق ہے۔ (یعنی اس کے علاوہ اور کوئی منصب اس کی شایانِ شان نہیں ہے)۔[۱]

راوی صحیح بخاری امام ابو ذر الھروی رحمہ اللہ جو کہ امام دار قطنی جیسے جبل العلم اور خالص سلفی عالم کے شاگرد تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے قاضی ابو بکر محمد بن الطیب اشعری سے معانقہ کیا اور ان کے سر کو بوسا دیا اور دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے امام اور دین کا دفاع کرنے والے ہیں، تو آپ نے ان کی صحبت اختیار کر لی اور ان سے علم حاصل کرنے لگے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ خود تو اشعری بنے ساتھ ساتھ پورے مغرب اندلس وغیرہ میں اشعریت کی نشر واشاعت میں اہم ترین کردار ادا کیا۔[۲]

اسی طرح امام بیہقی رحمہ اللہ باوجود اس کے کہ خود بہت بڑے محدث و فقیہ اور امام حاکم رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث کے شاگرد تھے، لیکن شیخ المتکلمین ابو بکر بن فورک اشعری کی شاگردی اختیار کرنے کی وجہ سے عقیدہ کے بعض مسائل بالخصوص صفات باری تعالیٰ کے باب میں سلف صالحین کی راہ سے دور ہوگئے، اور کئی مقامات پر علمائے اہل حدیث کی راہ چھوڑ کر تاویل کا دامن تھامے نظر آئے۔

ابنِ عقیل حنبلی جن کا شمار انتہائی ذہین و فطین لوگوں میں ہوتا تھا، اور جو شروع شروع میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے منہج پر تھے، لیکن جب ابن الولید اور ابن التُّبان جیسے معتزلی علماء کے پاس جانے لگے اور چپکے چپکے ان سے علم حاصل کرنے لگے، تو آہستہ آہستہ ان کے اندر بھی بعض اعتزالی افکار گھر کر گئے، حتی کہ انہوں نے نصوص شرعیہ اور صفات باری تعالیٰ کی تاویلیں شروع کر دی اور سنت سے منحرف ہوگئے اور وفات تک ان شبہات و انحرافات سے جان چھڑانے سے قاصر رہے۔[۳]

عمران بن حطّان جو اپنے دور کے بڑے علما اور بے مثال شعراء میں سے تھے، جنہوں نے حضرت عائشہ، ابو موسیٰ اشعری اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کی ہیں، آپ کے بارے میں فرزدق جیسا شاعر کہتا ہے کہ "عمران بن حطان سب سے بڑے شعراء میں سے تھے، اگر وہ چاہتے تو ہمارے جیسے اشعار کہہ سکتے تھے، لیکن ہم ان کے جیسے اشعار

---

(۱) (تاریخ الإسلام ووفیات الأعیان للذہبی ۳/۹۴۱-۹۴۵)۔

(۲) (سیر إعلام النبلاء للذہبی ۱۷/۵۵۹)۔

(۳) (سیر إعلام النبلاء للذہبی ۱۹/۴۴۷، ذیل طبقات الحنابلۃ لابن رجب ۱/۳۲۲)۔

نہیں کہہ سکتے "اس کے باوجود آپ نے ایک خوبصورت خارجی خاتون سے یہ کہتے ہوئے شادی کر لی کہ میں اسے اپنی طرح متبع سنت بنالوں گا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس خاتون نے انہیں اپنے خارجی مذہب کا پیروکار بنالیا۔ (۱)

محمد بن السائب الکلبی بہت بڑے مؤرخ اور جلیل القدر مفسر تھے، ایک دن انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ مجھے مرجئہ کے پاس لے چلو تاکہ میں ان کی باتیں سنوں، چنانچہ ان کے پاس سے لوٹنے سے قبل ہی وہ ان کے افکار سے متاثر ہو کر مرجئ ہو گئے، حتی کہ شیعہ اور پھر رافضی بن گئے۔ (۲)

اور جیسا کہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صاف وشفاف اور خالص دین پر قائم تھے، ان میں کسی قسم کا فکری و منہجی اور دینی و شرعی انحراف نہیں تھا، چنانچہ عہد خلافتِ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی ادوار میں مسلمان اسی حالت پر برقرار رہے، لیکن جب خلافتِ اسلامیہ کی توسیع ہوئی اور مختلف مذاہب وادیان کے ماننے والے اور متنوع افکار و نظریات کے حاملین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، عربوں کا عجمیوں سے اختلاط ہوا، اور مسلمان قسم قسم کی تہذیب وثقافت اور عقائد و نظریات سے روشناس ہوئے، مختلف مذاہب وافکار کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے مطالعہ کرنے لگے، عبد اللہ بن سبا جیسے لوگوں کی باتیں سننے لگے، معبد جہنی، غیلان دمشقی، جہم بن صفوان، واصل بن عطاء، نظام المعتزلی، سوسن نصرانی، بشر المریسی اور ابن ابی دؤاد جیسے ائمہ بدعت وضلالت سے علم حاصل کرنے لگے، ہندی ویونانی منطق و فلسفہ کی کتابوں کو منبع علم و حکمت سمجھ کر انہیں حرز جان بنالئے، تو مسلمانوں میں انحراف کا آغاز ہو گیا اور لوگ قسم قسم کی بدعتیں ایجاد کر کے الگ الگ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے، جس کا نتیجہ بلآخر ذلت وخواری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بدعات وانحرافات کے اس آغاز اور تسلسل میں دو چیزوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا: پہلی: منحرفین اور گمراہ لوگوں کی صحبت ومعاشرت اور ان سے حصول علم، اور دوسری: حکمت و فلسفہ کے نام پر ضلالت وجہالت اور گمراہیوں سے پر کتابوں کا مطالعہ۔

---

(۱) (سیر اعلام النبلاء للذہبی ۴/۲۱۵)۔

(۲) (الابانۃ الکبری لابن بطۃ ۴۶۲ ح: ۴۵۹)۔

اسلامی نظام وراثت کی خوبیاں

فضیلۃ الشیخ محمد اشفاق سلفی
مدرس دارالعلوم احمدیہ سلفیہ، دربھنگہ (بہار)

مال اللہ تعالیٰ کی ایک اہم نعمت ہے، اس پر زندگی کا انحصار ہے، لہٰذا اس کی حفاظت کے پیش نظر ہی بیوقوفوں کو مال دینے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ وہ اسے ضائع نہ کریں۔ مال کو ضروریات زندگی کی فراہمی، مباح لذتوں کے حصول اور آخرت کو سنوارنے میں خرچ کرنا چاہیے۔ مال تو اصل میں اللہ تعالیٰ کا مال ہے جو انسان کے پاس ایک مدت متعینہ کیلئے بطور امانت ہے، اللہ نے انسان کو اس میں خلیفہ بنایا ہے اور اپنی رضا کے کاموں میں خرچ کا حکم دیا ہے۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ صرف اس کا عمل جاتا ہے۔ جبکہ مال دنیا میں ہی رہ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی نازل کردہ شریعت کے مطابق وارثان میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال کی تقسیم بذات خود فرمائی ہے، اس کو انسان کی خواہش اور نظریہ پر بالکل نہیں چھوڑا ہے۔ اعتدال اور عدل و انصاف کو اللہ تعالیٰ کی طرح کون برت سکتا ہے۔ علم و حکمت کی بنیاد پر اس نے تقسیم فرمائی ہے اور نہایت عمدہ اور جامع طریقہ پر تقسیم ترکہ کے احکام کو ایک آیت میں اجمالاً اور تین آیات میں تفصیلاً بیان فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ اس باب میں دو تین حدیثیں مزید وضاحت کے لئے بیان کی گئی ہیں اور بس!

اللہ تعالیٰ کے یہ احکام ایسے وقت میں نازل ہوئے جب عہد جاہلیت کے دستور کے مطابق میت کا کل مال اس کا بڑا اور بالغ بیٹا لے لیتا تھا کیونکہ وہ جنگ و قتال کر سکتا تھا اور خاندان کی طرف سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکتا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو میت کا بھائی یا چچا لے لیتا، لیکن میت کی بیوی، اس کی بیٹی حتی کہ اس کی نابالغ اولاد ذکور کو بھی ترکہ سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے ایسے ظالمانہ نظام کا قلع قمع کیا، عورتوں کو مردوں کے ساتھ ترکہ میں شریک کیا اور اولاد ذکور؛ خواہ بڑی ہو یا چھوٹی سب کو ترکہ میں برابر کا حقدار بنایا گیا۔ سورۃ نساء کی آیت نمبر سات (۷) "للرجال نصيب مما ترك الوالدان و الاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان و الاقربون مما قل منه أو كثر نصيبا مفروضا" (ترجمہ: مردوں اور عورتوں کے لئے ماں باپ اور قرابت مندوں کے متروکہ مال میں خواہ کم ہو یا زیادہ حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ جس کی حیثیت مقررہ فرض کی ہے)۔ یہ آیت صحابی جلیل حضرت سعد بن الربیع انصاری رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کے سلسلے میں نازل ہوئی جب وہ جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ قتال کرتے ہوئے شہید کر دئے گئے اور پھر ان کے بھائی نے عرب کے دستور کے مطابق سارا مال اکیلے ہی لے لیا تو سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں

اور عرض گزار ہوئیں کہ یہ سعد کی بیٹیاں ہیں جو جنگ احد میں شہید ہوگئے ان کے چچا نے سارا مال لے لیا ہے اور اب ان کی شادی بھی مال کے بغیر انجام کو نہیں پہنچے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ ضرور اللہ تعالیٰ اس معاملے میں اپنا حکم نازل فرمائے گا، چنانچہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے بھائی کو بلا کر مال میں تصرف سے منع کر دیا گیا۔ پھر آیات ۱۱ اور ۱۲ نازل ہوئیں جن میں وارثان اور مختلف حالات میں ان کے مختلف حصے کی وضاحت کی گئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے کنبہ کو بلایا۔ آیات سنائی اور فرمایا کہ سعد کی بیوی کو آٹھواں حصہ اور دونوں بیٹیوں کو دو تہائی حصے دئے جائیں گے اور باقی حصے سعد کے بھائی لے لیں گے۔ گویا ۲۴ پوائنٹس میں سے تین پوائنٹ بیوی کو اور سولہ بیٹیوں کو دینے کے بعد باقی پانچ حصے بھائی کو دئے جائیں گے، اس طرح یہ قضیہ حل کر دیا گیا۔ (۱)

سورۃ نساء کی آیات میراث ۱۱ اور ۱۲ کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ میت اگر اپنے پیچھے بیٹا اور بیٹی دونوں چھوڑے تو ایک بیٹے کو دو بیٹیوں کا حصہ دیا جائے گا۔ بیٹی ایک ہو اور بیٹا نہ ہو تو وہ آدھا مال لے گی، اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال کی حقدار ہوں گی۔ میت کے والدین ماں باپ کو 1/6 اور 1/6 ہر دو کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ اگر میت کے بھائی بہن ایک سے زائد نہ ہوں اور بیٹا بیٹی اور پوتا پوتی بھی نہ ہو، صرف والدین وارث ہوتے ہوں تو ماں کو 1/3 اور باقی 2/3 باپ کو دے دیا جائے گا۔ البتہ اگر زوجین میں سے کوئی ایک موجود ہو تو اس کا حق ادا کر دینے کے بعد بقیہ مال کا 1/3 حصہ ماں کو اور 2/3 باپ کو دے دیا جائے گا۔

آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے زوجین کا ترکہ بیان فرمایا، چنانچہ شوہر کو اُسکی وفات یافتہ بیوی کے ترکہ سے 1/2 دیا جائے گا جب کہ بیوی صاحبِ اولاد نہ ہو، اور اگر اُسکے پاس کوئی بچہ ہو تو شوہر چوتھائی مال 1/4 کا حقدار ہوگا۔ اور بیوی کو 1/4 دیا جائے گا جبکہ شوہر صاحب اولاد نہ ہو، اور اگر اس کے پاس کوئی اولاد ہو تو وہ 1/8 کی حقدار ہوگی۔ (شوہر کے مقابلے میں بیوی کو آدھا مال دیا جاتا ہے) اور آیت کے اخیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ مرنے والا مرد یا عورت اگر کلالہ ہو یعنی اصل وارث مذکر باپ دادا اور فرع وارث بیٹا بیٹی پوتا پوتی کوئی موجود نہ ہو اور میت کا ماں جائی بھائی بہن جسے اخیافی بھائی بہن کہتے ہیں ایک ہو، خواہ بھائی ہو یا بہن 1/6 پائے گا اور ایک سے زیادہ ہوں تو 1/3 میں سب برابر کے شریک ہوں گے۔ اس جگہ مذکر بھائی کو دو مونث بہن کا حصہ نہیں بلکہ بھائی بہن کو برابر طور پر تقسیم کرینگے، کلالہ اکیل سے ھے اور اکلیل تاج کو کہتے ہیں جو سر کے کناروں کو پکڑتا ہے اور پورا سر کھلا رہتا ہے، گویا میت کے پاس اُسکا اپنا اصل اور قریب ترین وارث نہیں ہے۔ اخیافی بھائی بہن یا سگے اور سوتیلے بھائی بہن ہیں جن کی حیثیت حاشیہ کی ہے جو تاج کے مثل کنارہ پکڑنے والے ہیں۔ سگے بھائی بہن اور

(۱) (سنن ترمذی: ۲۰۹۲، ابن ماجہ ۲۷۲۰ عن جابر بن عبداللہ)۔

انکی عدم موجودگی میں سوتیلے بھائی بہن کا مسئلہ سورۃ نساء کی آخری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ویستفتونك في الكلالة..... الى آخر الآية۔

سگی بہن اکیلی ہو تو 1/2 لیگی اور اگر دو یا اس سے زائد ہوں تو 2/3 لیں گی۔اور اگر بھائی بہن دونوں موجود ہوں تو مذکر کو دو مونث کے برابر دیا جائے، بالکل اولاد ذکور واناث کی طرح، جیسا کہ سورہ نساء آیت ۱۱ میں بیان کیا گیا ہے۔واضح رہے کہ اگر میت کے پاس باپ یا بیٹا اور بیٹی موجود ہو تو بھائی بہن کو ترکہ نہیں دیا جاتا، صرف بیٹی ہو اور دوسرے حصہ دار جن کا حصہ مقرر ہے، موجود ہوں تو ان کو دینے کے بعد باقی ماندہ مال سگے یا سوتیلے بھائی / بھائی بہن کو دیا جاتا ہے۔اور اگر میت کے پاس باپ یا بیٹا ہو، یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پوتا ہو تو بھائی بہن، اور چچا وغیرہ میں سے کوئی بھی وارث نہیں ہوتا۔

یہ آخری آیت نساء حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کے متعلق اتری ہے، جن کے پاس اولاد نہ تھی۔ بھائی بہن ہی وارث ہو رہے تھے۔ یہ آیت حجۃ الوداع کے لئے مدینہ سے نکلنے سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ جبکہ میراث کی ابتدائی آیات گیارہ اور بارہ جنگ احد کے بعد سعد کے واقعہ کے تناظر میں نازل ہوئیں۔اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید میں آیات مبارکہ کی ترتیب توقیفی ہے، اگر دلیل پر مبنی نہ ہوتی تو مناسب تھا کہ اس آیت اخیرہ کو بھی گیارہویں اور بارہویں آیتوں کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔ دوسری بات یہ کہ سورہ نساء کی بارہویں آیت میں کلالہ اور بھائی بہن کا جو ذکر ہے وہ اخیافی بھائی بہن ہیں۔اور آخری آیت کلالہ میں جس بھائی بہن کا ذکر ہے وہ سگے بھائی بہن ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں سوتیلے بھائی بہن (باپ ایک ہو اور مائیں الگ) کا معاملہ بھی سگے جیسا ہے۔ تیسری بات جسکی وضاحت پہلے بھی کی جاچکی ہے کہ اگر میت کے پاس باپ اور بیٹا میں سے کوئی بھی موجود ہوگا تو بھائی بہن کی کوئی بھی قسم ترکہ پانے سے بالکلیہ محروم ہوگی۔ایک اہم بات یہاں پر سمجھنے کی یہ بھی ھے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کلالہ میں دو بہنوں کو 2/3 مال کا حقدار بنایا تو بہن کے مقابلے میں میت کی بیٹیاں زیادہ قریب ہیں، لہٰذا اگر وہ بھائی کے بغیر مسئلہ میں دو ہوں گی تو دو بٹہ تین مال بدرجہ اولیٰ لیں گی، اگرچہ قرآن مجید میں بیٹیوں کے معاملے میں فوق اثنتین (دو کے اوپر) کہا گیا ہے۔فوق کا مطلب صرف یہ بتانا ھے کہ بیٹیاں ایک سے زائد جتنی بھی ہوں؛ دس بیس سبھی دو تہائی میں بٹوارا کریں گی۔علاوہ ازیں سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ کی دو بیٹیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تہائی مال دیا لہٰذا فوق اثنتین کے ظاہری لفظ سے کسی کو مغالطہ نہیں ہونا چاہئے۔علاوہ ازیں ایک بیٹی کو آدھا مال دینے کا حکم ہے، اور دو بیٹیاں بہر حال نصف میں شامل نہیں ہیں تو آخر ان کا ترکہ کیا ہوگا؟ بیٹیوں کا ترکہ اور حصہ صرف دو ہے: نصف (آدھا) اور دو تہائی۔آدھا ایک بیٹی کا ہے، تو ظاہر ھے کہ دو اور دو سے زیادہ بیٹیوں کا حصہ دو بٹہ تین ہوگا۔ الحمدللہ صورت مسئلہ بالکل واضح بلکہ اظہر من الشمس ہے۔

قارئین کرام ! آپ نے مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہوگا کہ کس قدر جامع، دقیق اور مبنی بر عدل قوانین ہیں جنہیں اللہ تعالی نے ہماری ہدایت اور معاملہ کے تصفیہ کے لئے نازل فرمایا ہے۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی دانا وبینا کیوں نہ ہو؛ اگر وہ اصول ترکہ مقرر کرتا، تو کہیں نہ کہیں بے اعتدالی اور ناانصافی لازما نظر آتی، لیکن یہ اللہ علیم وحکیم کا نازل کردہ قانون ہے۔ تینوں آیات المواریث میں "إن الله كان عليما حكيما" (بیشک اللہ تعالی کامل علم وحکمت والا ہے) "والله عليم حليم" (اور اللہ تعالی دانا اور بردبار ہے) اور "والله بكل شئى عليم" (اور اللہ تعالی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے)۔ علم وحکمت کا ذکر قوانین کی حقانیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

قانون وراثت اور تقسیم ترکہ کو اللہ تعالی نے "نصيبا مفروضا" فرض کردہ حصہ قرار دیا ہے، ساتھ ہی اسے اللہ تعالی نے وصیت سے تعبیر کیا ہے جو تاکیدی حکم کو کہتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ آیت ۱۳ اور ۱۴ سورہ نساء میں ان قوانین کو "تلك حدود الله" (یہ اللہ کے حدود ہیں) کہہ کر مزید ان کی پابندی کو مؤکد بنایا گیا ہے۔ اور اطاعت گزاروں اور نافرمانوں کے انجام بیان کئے گئے ہیں۔ کیا ان وضاحتوں اور تاکیدات کے باوجود کوئی مسلمان مرد وعورت جسے اللہ اور یوم آخرت کا خوف ہے؛ قانون میراث اور دیگر شرائع واحکام الٰہیہ کی مخالفت کرنے کی جسارت کر سکتا ہے؟۔ حاشا وکلا۔ حدود اللہ ، اللہ کی مقرر حدیں دو ہیں ایک واجب حدود اور دوسری حرام حدود، واجب حدود؛ واجبات اور فرائض کی بجاآوری کا نام ہے جن کے تعلق سے فرمایا گیا "فلا تعتدوها" انہیں تجاوز یعنی ترک نہ کرو۔ اور حرام حدیں؛ گناہوں اور منکرات کا ارتکاب ہے جن کے متعلق "فلا تقربوها" کہا گیا، کہ ان سے قریب نہ ہو۔

لہٰذا ضروری ہے کہ جو قوانین بیان کئے گئے ہیں ان سے انحراف ہر گز جائز نہیں ہے، ورنہ انسان رسوا کن عذاب سے دوچار ہوگا۔

اسلام کا فلسفہ میراث:

(۱) اسلام نے ترکہ کی تقسیم میں قرابت مندی کو بنیاد بنایا ہے اور دوسرے تمام اسباب کی نفی کی ہے۔

(۲) قرابت مندی میں جو جتنا زیادہ قریبی وارث ہے وہ دور کے رشتہ دار کے مقابلے میں ترکہ پانے کا زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ باپ کی موجودگی میں دادا محجوب اور بیٹے کی موجودگی میں پوتا محجوب ہوتا ہے۔ (البتہ دادا پر لازم ہے کہ وہ ایک تہائی مال تک پوتے پوتیوں کو وصیت کر جائے)۔

(۳) قرابت مندی میں جو زیادہ مضبوط ہے وہ کمزور قرابت مند پر مقدم ہے، اس لئے سگے بھائی بہن، سوتیلے بھائی بہن پر مقدم ہیں، اسی طرح سگا چچا سوتیلے چچا پر۔

(۴) زندگی کا استقبال واستدبار۔ ایک وارث زندگی کا استقبال کر رہا ہے اور دوسرا زندگی کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ بیٹے کے سامنے زندگی پڑی ہے اور باپ بوڑھا ہو چکا ہے جو دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ اس لئے ہر چند کہ باپ اور ماں کا مقام بلند ہے۔ اللہ تعالی نے باپ ماں کے مقابلے میں بیٹے اور بیٹی کو زیادہ ترکہ دیا ہے، کیوں کہ زندگی کی مشکلات اور اخراجات کے متحمل میت کے بیٹے بیٹی ہونے والے ہیں نہ کہ ماں باپ۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب: اسلام کے نظام وراثت پر ایک مشہور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں بیٹے اور بیٹی کے مابین ترکہ میں فرق رکھا گیا ہے۔ ایک بیٹا دو بیٹیوں کا حصہ پاتا ہے۔ یوں بیٹی مظلوم ہے۔ حقیقیت میں یہ بے جا اور غیر دانشمندانہ اعتراض ہے۔ اسلام کا قانون وراثت مثالی ہے، اللہ علیم و حکیم کا نازل کردہ ہے، بھلا اس میں ناانصافی کے لئے کہاں جگہ ہو سکتی ہے۔ اسلام نے ذمہ داری کو ملحوظ رکھا ہے۔ مرد پر مالی ذمہ داری زیادہ ہے جو عورت پر نہیں۔ مرد اپنی بیوی کو حق مہر دیتا ہے، وہ اپنی بیوی اور بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہے، عائلی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا پورا بوجھ مرد پر ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے حق مہر ملتا ہے، عورت اپنے شوہر اور بال بچے، یہاں تک کہ خود اپنے اخراجات اور نفقات لازمہ کی ادائیگی کی پابند نہیں کی گئی ہے، اس کے تمام تر ضروری اخراجات مرد کے ذمہ ہیں۔ ایسی صورت میں اگر مرد اور عورت کو برابر ترکہ دیا جاتا تو یہ مرد پر ظلم ہوتا۔ عورت؛ جسے اخراجات سے آزادی حاصل ہے وہ برابر حصہ لیکر کیا کریگی۔ جبکہ وہ بیک وقت باپ، ماں، بھائی، بیٹے، بیٹی اور شوہر کے مال سے ترکہ پاتی ہے۔ جس قدر اسکو شریعت میں حصہ دیا جاتا ہے وہ اس کی زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اور پھر یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو نہ صرف عورتوں کو ترکہ سے محروم کرتے تھے بلکہ خود عورتوں کے وارث بن بیٹھتے تھے۔

(۵) اسلام کا قانون وراثت ہے کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے۔ والدین اور دیگر وارثان کے حق میں وصیت کا حکم منسوخ ہے۔ حدیث ہے: "إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث".[1]

ترکہ کی تقسیم کے وقت اصحاب الفرائض؛ جن کے حصے شریعت میں مقرر ہیں ان کو مقدم رکھا جائے گا، پھر جو مال بچے گا وہ عصبہ میں تقسیم کیا جائے گا۔ عصبہ وہ قریبی مرد حضرات ہیں جو میت کے گرد جمع رہا کرتے تھے۔ یہ تعصیب سے ہے

(۱) (سنن ابی داؤد۔ حدیث نمبر: ۲۸۷۰ عن ابی امامہ الباہلی)۔

جس کا معنی سر کی پٹی اور عمامہ ہے جو سر کو گھیرے رکھتا ھے اور اس کی حفاظت کرتا ھے۔ جیسے بیٹا، باپ، دادا، بھائی اور چچا وغیرہ۔ کسی میت کے پاس ایک یا زیادہ بیٹا ہو تو باپ اور ماں اور میاں بیوی میں سے جو زندہ ہوں ان کا مقررہ حق دینے کے بعد تمام باقی ماندہ مال بیٹا لے لے گا۔ عصبہ میں ہر قریبی وارث اپنے بعد کے عصبہ وارث کو محجوب کر دیتا ہے۔ بیٹا ہے تو پوتا وارث نہیں، باپ ہے تو دادا نہیں، اور سگا بھائی ہے تو سوتیلا نہیں، سگا چچا ہے تو سوتیلا محجوب ہے۔ بیک وقت صرف باپ، ماں، بیٹا، بیٹی اور احد الزوجین وارث ہو سکتے ہیں، گویا عصبہ میں بیٹا باپ کو محجوب نہیں کرتا، البتہ بیٹا یا باپ دوسرے سبھی قریبی مرد رشتے دار کو محجوب کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے: "ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فلِأَوْلى رجلٍ ذكرٍ".(۱) جن کے حصے مقرر ہیں ان کو پہلے دو، پھر جو میت کا قریب ترین مرد وارث ہو اس کو باقی ماندہ مال دیا جائے۔

مسلم معاشرہ کی موجودہ صورت حال:

موجودہ دور میں عورتوں کو ترکہ سے محروم کر دینے کا چلن عام ہے جو سراسر ظلم، قہر اور باطل طریقہ سے دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ عورتوں کی ترکہ سے محرومی دور جاہلیت کا وہ رواج ہے جس کو اسلام نے باطل قرار دیا ہے۔ لوگ ایک بار پھر دور جاہلیت کی طرف مال کی حرص و طمع میں پلٹ رہے ہیں۔ بیٹی بھی اپنے باپ کی اولاد ہے جس طرح بیٹا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی وصیت ترکہ کے خلاف یہ ستم کیوں روا رکھا جا رہا ہے؟ کیا یہ عذاب الٰہی کو دعوت دینا نہیں ھے؟ تعلیم اور شادی بیاہ کر دینے کے نام پر بڑا بھائی اپنی بہنوں کے یا چھوٹے بھائیوں کے ترکہ کو ہضم کر رہا ہے۔ عورتوں اور چھوٹے بچوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر مسلم معاشرہ کے ظالم بھائی اور بیٹے؛ اپنی بہن اور ماں کو شریعت کے مقررہ حق سے جسے قرآن مجید نے اللہ کی وصیت اور تاکیدی حکم قرار دیا ہے محروم کر رہے ہیں۔ اور بہن ہے کہ اپنا حق لینے کے لئے کبھی بھائی کی چوکھٹ، تو کبھی عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹا رہی ہے۔ یہ ایک گھناؤنی حرکت ہے جو اسلام کے چہرۂ مصفی کو داغدار کر رہی ہے۔ اور اگر بھائی بہن چھوٹے ہوں تو یہ یتیموں کا مال کھانا ہے جس کی سخت وعید قرآن مجید میں آئی ہے ۔ایسے لوگ جہنم کے انگاروں سے اپنا پیٹ بھر رھے ھیں۔ والعیاذ باللہ۔

آج اسی ترکہ کی تقسیم کو لیکر رشتے کٹ رہے ہیں اور دلوں میں حسد و عداوت کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں۔ اگر لڑ جھگڑ کر بہن نے اپنا ترکہ لے لیا تو پھر ہمیشہ کے لئے بھائی بہن کے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات ترکہ سے محروم عورتیں

(۱) صحیح البخاری۔ حدیث نمبر: ۶۷۴۶ عن ابن عباس)۔

اپنا اور اپنے چھوٹے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے (اگر شوہر کنگال مر گیا ہو) میدان عمل میں ذلت کو برداشت کرتے ہوئے روزی روٹی کمانے پر مجبور نظر آتی ہیں۔

یقیناً مورثین کے ترکہ میں عورتوں کا بحیثیت ماں، بیٹی اور بہن شرعی حصہ ہے، جس کی ادائیگی بہر حال فرض ہے، اور جو لوگ حیلے بہانے سے ان عورتوں کو ان کا حق نہیں دیتے وہ ظالم، سرکش، مال حرام کھانے والے اور شریعت کے احکام کو معطل کرنے والے ہیں، انہیں اللہ سے اور اس کے رسوا کن عذاب سے خوف کھانا چاہیے اور حقداروں کو ان کے حقوق دے کر اللہ کی شریعت کو نافذ کرنا چاہیے تاکہ وہ دنیا اور آخرت ہر جگہ سرخرو ہو سکیں۔

میت کی موت کے بعد جتنی جلد ممکن ہو میت کے قرضوں کی ادائیگی اور اس کے بعد باقی ماندہ مال میں ایک تہائی مال تک وصیت (اگر میت نے کی ہو) کی تنفیذ کے بعد وارثان میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشا کے مطابق ترکہ تقسیم کرنا چاہیے۔ جس قدر ترکہ بانٹنے میں تاخیر کی جائے گی اسی قدر معاملہ پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے قوانین پر چلائے اور اپنے شرعی حدود کا پاس و لحاظ رکھنے کی بھرپور توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

والحمد لله رب العالمين.

منظومة البيقونية في مصطلح الحديث: تعارف اور شروحات (قسط اول)

ابوالمدیح بلال الخلیلی
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

علم مصطلح الحدیث احادیث نبویہ کی صحت و ضعف کی معرفت کے لئے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے، جس پر متعدد علما و محدثین کی تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے درمیان موجود ہے، جس کے اندر اس علم کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، نیز اس کی تحصیل اور تسہیل کے لئے متعدد مختصر کتابیں منظوم و منثور پیرائے میں تحریر کی گئی ہیں، لیکن جب بات اس علم کے بنیادی قواعد کے حفظ کی کی جائے تو اکثر طلبا کے اذہان میں ایک ہی متن گردش کرنے لگتا ہے، جو طلبا کے مابین "متن البیقونیہ" یا "منظومہ البیقونیہ" کے نام سے معروف ہے۔ یوں تو اس فن میں متعدد منظومات ترتیب دی گئیں، جن میں قابل ذکر "طرفة الطرف فی مصطلح من سلف للفاسی" اور "قصب السكر في منظومة نخبة الفكر للصنعاني" وغیرہ ہیں، لیکن متعلقہ فن میں جو پذیرائی "منظومہ البیقونیہ" کو حاصل ہوئی اتنی مقبولیت کسی دوسرے متن کو نصیب نہیں ہوئی۔

زیر بحث "منظومہ" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک متعدد زاویوں سے اس کی خدمت انجام دی جاچکی ہے، لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اہل علم کے مابین امام بیقونی رحمہ اللہ کی وجہ شہرت یہی واحد متن ہے، حتی کہ عرب علما آپ کو (العالِم صاحب الورقة الواحدة) سے بھی موسوم کرتے ہیں، اس کے علاوہ آپ کی کسی تالیف کا ذکر اہل تراجم کے یہاں نہیں ملتا، بلکہ بعض علما نے آپ کے اصل نام میں بھی اختلاف کیا ہے، جیسا کہ امام زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ولم أقف له على اسم، ولا ترجمة ولا ما هو منسوب إليه" کہ میں ان کے نام، تذکرہ اور نسبت پر مطلع نہیں ہوسکا۔

جب بندہ اپنے عمل میں مخلص ہوتا ہے تو اللہ تعالی اس کے اثر کو باقی رکھتا ہے اور اسے مبارک بھی بنا دیتا ہے، خواہ وہ عمل بادی النظر میں معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ امام بیقونی کا یہ منظومہ اسی بات کی غمازی کرتا ہے۔ یہ منظومہ مصطلح الحدیث کے صرف ۳۴ اقسام پر مشتمل یک ورقی منظومہ ہے، لیکن اس کی شہرت و مقبولیت اس فن میں کئی مجلد گمنام کتابوں سے زیادہ ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر عرب ممالک میں بالعموم اور سعودی عرب میں بالخصوص فن مصطلح الحدیث میں اس

متن کے حفظ کی ترغیب دی جاتی ہے، حتی کہ حرمین شریفین اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے متون کے حلقے میں بھی یہ کتاب شامل نصاب ہے، نیز برصغیر کے بعض مدارس کے نصاب کا بھی حصہ ہے۔

صاحب منظومہ کا تعارف:

نام و نسب: عمر بن محمد بن فتوح البیقونی الدمشقی الشافعی۔ بعض لوگوں نے آپ کا نام طہ بھی ذکر کیا ہے۔

جائے پیدائش: علما کی ایک رائے کے مطابق آپ کا تعلق "بیقون" نامی بستی سے تھا، جس کا محل وقوع ملک آذربیجان، علاقہ کرد کے قریب ہے۔[۱] آپ کے ہم عصر امام حموی رحمہ اللہ آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں ناظم کے نام و نسب پر مطلع نہیں ہو سکا، نہ ہی "بیقون" کے تعلق سے مجھے کوئی جانکاری ہے کہ آیا وہ کسی شہر کا نام ہے یا قریہ کا یا قبیلہ کا۔[۲]

بعض دوسرے مؤرخین کے مطابق مذکورہ نسبت ملک لبنان میں بیروت سے ۵۵ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک بستی کی طرف ہے، اور جیسا کہ صاحب منظومہ کی نسبت میں ذکر کیا گیا کہ آپ دمشقی ہیں، لہٰذا اقرب الی الصواب یہی لگتا ہے کہ آپ کی ولادت اسی بستی میں ہوئی۔

مؤلفات:

(۱) منظومہ بیقونیہ (مطبوع)۔

(۲) فتح القادر المغیث (مفقود)۔ (بعض علما نے اس کتاب کی نسبت امام بیقونی رحمہ اللہ کی جانب کی ہے)۔

وفات:

آپ کی تاریخ ولادت اور وفات کے متعلق اہل تراجم خاموش ہیں، البتہ اکثر محققین کے مطابق امام بیقونی رحمہ اللہ کا زمانہ ۱۰۸۰ھ بمطابق ۱۶۶۹ء سے ما قبل کا ہے۔

---

(۱) (الدرر البہیۃ)۔

(۲) (تلقیح الفکر بشرح منظومۃ الاثر)۔

A PEN WHICH HAS BEEN RAISED TO ASSIST, DEFEND THE PEOPLE OF TRUTH AND REFUTE FALSEHOOD AND ITS PROPONENTS IS THE BEST KIND.

(Imam Ibn Qayyim Rahimahullah: Al-Tibyan Fi Aemanil Qur'aan, Pg: 310)

Edition 1

MONTHLY

MANHAJ-E-SALAF

MAGAZINE

Issue 1 | Rajjab 1444 | January 2023

SEVERE TRIALS AND TRIBULATIONS UPON MERCY FOR THE WORLD ﷺ

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

«لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُخَافُ أَحَدٌ، وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللَّهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ، وَلَقَدْ أَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُونَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ وَمَا لِي وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَأْكُلُهُ ذُو كَبِدٍ إِلَّا شَيْءٌ يُوَارِيهِ إِبْطُ بِلَالٍ». سنن الترمذي: (٢٤٧٢).

ANAS (MAY ALLAH BE PLEASED WITH HIM) REPORTED THAT THE MESSENGER OF ALLAH (MAY ALLAH'S PEACE AND BLESSINGS BE UPON HIM) SAID: "I HAVE BEEN INTIMIDATED IN THE PATH OF ALLAH AT A TIME WHEN NO ONE ELSE WAS INTIMIDATED, AND I HAVE BEEN HARMED FOR THE SAKE OF ALLAH AT A TIME WHEN NO ONE ELSE WAS HARMED, AND I ONCE SPENT THIRTY DAYS AND NIGHTS WHEREIN I AND BILĀL HAD NOTHING A LIVING BEING CAN EAT EXCEPT A LITTLE THAT WAS KEPT UNDER BILĀL'S ARMPIT."

www.salafimanhaj.info